بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیاد گار : محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند کا دینی، علمی، اصلاحی و ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

اگست تا اکتوبر
۲۰۱۵
جلد نمبر ۱۷
شمارہ نمبر ۱/۲/۳
سلسلہ نمبر ۱۶۵/۱۶۶/۱۶۷

بانی فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ

مدیر سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

مجلس ادارت

مولانا عبد الرشید بستوی
09634506041

مولانا فضیل احمد ناصری
08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی
09997504588

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 09412496763-08006075484

ای۔میل: jimask94@gmail.com, ahmadanzarshah@gmail.com

اشتراک وتعاون

اندرون ملک :
فی شمارہ-/15 سالانہ-/150
خصوصی-/1000
تاحیات -/10000

بیرون ملک:
سالانہ:20امریکی ڈالر
خصوصی:100امریکی ڈالر
تاحیات:500امریکی ڈالر

مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت دیوبند کو ہی ہوگا۔

Composed By: Umar Ilahi DBD. 09358013409

ورق در ورق

صریر خامہ

عصریات	سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری	۳

نوادرات امام کشمیریؒ

تفسیر سورۂ نجم	امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ	۷

قرطاس و قلم

تاریخ حفاظت قرآن	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	۹
حج کے روحانی واقتصادی پہلو	مولانا محمد مزمل بدایونی	۲۱
قربانی کی حقیقت اور پس منظر	مولانا مفتی محمد ساجد	۲۵
بارش کی کمی.....لمحۂ فکریہ	مولانا سید احمد ومیض ندوی	۲۹
آزادئ اظہار رائے اور خلفائے راشدین	محمد مبشر نذیر	۳۳
بہ وقتِ اقامت مقتدیوں کو کب کھڑا ہونا چاہئے	مولانا مفتی نثار خالد قاسمی	۳۷

آغاز سفر

دار العلوم دیوبند کا پیغام اور اس کے مقاصد	محمد سالم بستوی، محمد راشد اعظمی	۴۸
فقہ و فتاویٰ	مولانا مفتی نثار خالد قاسمی	۵۶
جامعہ کی سرگرمیاں	مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی	۶۰
ہوا کے دوش پر	رضوان سلمانی	۶۴

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

عصریات

✤سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

گردش لیل ونہار کی رفتار والٹ پھیر اس قدر برق رفتار کہ استاد دہلوی نے کہا تھا ع

رو میں ہے رخش عمر دیکھیے اب کہاں تھمے ☆ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

صبح وشام کی آمد ورفت، آفتاب کا طلوع پھر تیزی کے ساتھ غروب وقت کی تیز رفتاری زمانہ کی چال، حیطۂ تحریر میں نہیں لائی جاسکتی، شاید پلک جھپکنے کا محاورہ بھی وقت کی رفتار کے سامنے تھک ہار کر بیٹھ گیا، البتہ ایک چیز جو اس دوڑ میں وقت کی رفتار کا سانس پھلائے ہوئے ہے وہ ہندستان کی سیاست کے تیزی کے ساتھ بدلتے مناظر، اس کی برق رفتاری کو بیان کرنے سے زبان کنگ، اور قلم عاجز، کس واقعہ پر آنسو بہائیں، کس بیان پر ماتم کریں، اور کس عمل پر چلائیں، ہر صبح نیا فسانہ، ہر شام تازہ داستان ہر گھنٹے دل ودماغ کو مفلوج کردینے والا حادثہ، ہر گھڑی کوئی نیا زخم اس قیامت خیز تسلسل میں کس اور کون سے واقعہ، بیان اعلان، وغیرہ پر کچھ سپردِ قلم کیا جاسکتا ہے ہر لمحہ پیش آمدہ واقعہ اسی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ طاق نسیان کا گلدستہ۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

سرِدست ملک کی سب سے بڑی ریاست بہار میں الیکشن کا بخار رفتہ رفتہ وبائی شکل اختیار کرتا جارہا ہے، بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے حشرات الارض کے برابر حجم اور جسم جثہ رکھنے والے سیاست دانوں سے لے کر ہمالہ کے سائز کے پالیٹیشین بہار میں منعقد ہونے والے مہابدھ میں زور آزمائی کے لیے کمر کس رہے ہیں۔

اپنے وقتوں کے ناقابل تسخیر زور آور اور آج کے کمزور ترین بیمار سیاست داں سیکولرزم بچاؤ ملک بچاؤ کے نعرے لگاتے ہوئے لنگر لنگوٹ کس کر میدان کو جیتنے کے لیے جتھا بندی کررہے ہیں مرکز سے برسر اقتدار پارٹی بھی اپنے تمام حربوں حیلوں کانٹے اور کیلوں سے تیار اپنی پوری قوت جھونکنے کی تیاری کررہی ہے۔

پھر وہ آوازیں، تحریریں، تقریریں، مذاکرے، مباحثے، مجادلے سننے اور پڑھنے اور دیکھنے کو مل رہے ہیں جو ہر الیکشن کے موسم میں پیش آتے ہیں۔

فرقہ پرستی، مذہبی منافرت، عدم برداشت کا جو ماحول موجودہ حکومت میں تیار ہوا، سابق میں اس کی نظیر

نہیں ملتی، عدم تحفظ، ماحول کی تنگی، تنگ نظری، زبان درازی جس سے آج قدم قدم پر سابقہ ہے، وہ بھی سابق میں اس شدت سے نہیں تھی بقول شاعر ؎

کچھ لوگ تو ہر دور میں ننگے تھے مگر...☆ سارا ماحول برہنہ کبھی ایسا تو نہ تھا

متعدد سیاسی جماعتیں اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کے عدم تحفظ، محرومیوں اور مایوسیوں نیز حکومت کی جانب سے عدم دلچسپی بلکہ حوصلہ فرسائی کی دہائیاں دے کر اور سیکولرزم کے نعرے لبوں پر سجا کر مسلم اقلیت کے ووٹ کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی نظر آرہی ہیں، مقابلہ فرقہ پرستی سے بتایا جارہا ہے ووٹ کو انتشار سے بچانے کے لیے اپیلیں کی جارہی ہیں، اور تمام بچی کچھی طاقت کو مرکز میں براجمان قوت سے پنجہ آزمائی کے لیے تیار کیا جارہا ہے، اس پس منظر میں مقابلہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد نازک اور حساس ہوگیا ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

بہار کے گھماسان میں اچانک حیدرآباد کے ایک آدمی ایک پارٹی یا ''ون مین آرمی'' کا تأثر دینے والے، شبابی توانائیوں سے بھرپور قوتِ بیان کی صلاحیتوں سے لبریز بے باک بے لاگ، موقع محل، حالات گردوپیش ماحول اور تمام قیود سے بے فکر وانجان صلاح الدین اویسی کود پڑے، ادھر چند سالوں سے اویسی صاحب اپنے جذباتی بیانات جرأت آمیز تقاریر، نازک اور حساس مسائل پر حقائق آمیز گفتگو، پرکشش شخصیت، نیز جدید ذرائع ابلاغ کے سہارے کافی طاقت پکڑ چکے، حیدرآباد کے بعد مہاراشٹر میں انھوں نے اپنی سیاسی گرفت کا لوہا بھی منوایا ہے، جدید ذرائع ابلاغ نے ان کی شہرتوں کو ملکی حدود سے باہر بھی پہنچادیا، اور انھوں نے بلاشبہ اتنی طاقت بہم پہنچائی کہ وہ کسی بھی مسلم آبادی والے صوبہ میں حریف کو شکست سے دوچار کرسکیں یا نہ کرسکیں البتہ نتائج میں مدوجزر اور جوار بھاٹا لاسکتے ہیں اور بلاشبہ دانستہ یا نادانستہ فرقہ پرست طاقتوں کے لیے ان کی موجودگی تشفی وتسلی اور راہ کے آسان ہونے کا ذریعہ ہے، دوسری طرف سیکولرزم کی اور فرقہ پرستی سے پاک اقتدار کی کوشش کرنے والوں (اگر چہ وہ اوران کا سابقہ ریکارڈ آلودہ ہے) کے لیے اویسی صاحب کی آمد خطرہ کا الارم ہے۔ اور لاریب ایسی جماعتوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا جو ووٹ کی خاطر ہی سہی لیکن اس ملک میں فرقہ پرستی کا کچھ نہ کچھ مقابلہ کرتی ہیں، ان میں خلوص اور اخلاص کی تلاش نمک کی کان میں مٹھاس کی تلاش کے مترادف ہے، تاہم یہ تو اب مشاہدہ ہے کہ جو رنگ و روپ، ہاؤ بھاؤ اور رویہ فرقہ پرست طاقتوں نے اقتدار میں آنے کے بعد اپنایا ہے، وہ اگر چہ اہل نظر، اور سیاسی مبصرین کے لیے حیرت انگیز نہیں لیکن عام لوگوں کے لیے بھیانک ترین ہے، اور اگر یہ طاقتیں اسی طرح صوبہ درصوبہ توانائی حاصل کرتی رہیں تو RSS اور اس کی ذیلی تنظیمات کو اپنے اہداف حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا، بس یہ وہ نقطۂ اختلاف ہے جہاں اویسی صاحب کے فکر اور عمل سے حالات وحقائق میل نہیں کھاتے، موجودہ

ہندوستان میں ملت کو انتشار، وافتراق سے بچانے، سیاسی وزن اور اہمیت کو منوانے کے لیے آپ صرف اپنی ڈفلی اپنے راگ کے بل پر کامیاب نہیں ہوسکتے، محض اپنے بل بوتے پر اس اقلیتی عوامی قوت کو سیاست کے اقتدار کے ایوانوں تک نہیں پہنچا سکتے، تاوقتیکہ سیکولر اور دیگر توانیاں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔

صرف جذباتی بیانات، بے باکی اور بیجا جرأت مندی، مظلوم، بے کس وبے بس قوم کے لیے وقتی اور لمحاتی تسکین کا باعث تو ہوسکتی ہے مگر اس کا دوسرا رخ فرقہ پرست طاقتوں کا بے حد مضبوطی کے ساتھ منظّم ہوجانا اور اقتدار کی راہ آسان ہونا، کلیدی عہدوں پر فائز ہونا ہے، اور آخری انجام ملت کا بھاری نقصان، بس یہاں سے ملت اسلامیہ کی بے سمت وبے جا کشتی کو انتہائی چاق وچوبند اور سیاسی حذاقت وبصیرت کے ساتھ طوفانوں سے پار لگوادینا اس کڑے امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے کسوٹی ہے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

گجرات کے ۲۲/سالہ جوان رعنا ہاردک پٹیل نے گذشتہ دوہفتوں میں ۵۰/کے پیٹے میں اور اس سے متجاوز عمر کے گھاگ سیاست دانوں کے ہردے (دل) ہلادیئے ''پٹیل ریزرویشن'' کی تحریک گھنٹوں اور گھڑیوں کے حساب سے آسمانِ ہفتم پر پہنچ گئی اور وزیراعظم مودی کے قلعہ گجرات کی راج دھانی احمد آباد کی بنیادوں کو زیروزبر کردیا جس کی دھمک اور گونج ملک کے کونے کونے میں سنی گئی، وزیراعظم اور ان کے حاشیہ بردار وزراء کی پرفریب مسکراہٹوں اور مصنوعی مسرتوں کو چیرتی ہوئی نکبت اور ناکامی کی لکیریں صاف ان کے چہروں پر دیکھی گئیں، ہرفرعون را موسیٰ، کہ سنت الٰہی ہے جب مخلوق کے ظالم افراد اپنے ظلم او رجور کے سمندر میں غرق آب ہوجائیں جب حق وناحق کو جان بوجھ کر ''پھانسی'' پر چڑھانے لگیں، تو قادروقدیر ہستی اس کے گھر، اس کے قلعہ اور اس کی مضبوط پناہ گاہ ہی میں اسے ذلیل وخوار کرا کر اپنی حاکمیت اور قہاریت کا واضح اعلان کرتی ہے۔

پٹیل تحریک کے پوشیدہ عزائم کیا ہیں، تحریک کے عوامل ومحرکات، اور تحریک کے مختلف گوشوں پر سے نقاب ہٹانے کی کوششیں جاری ہیں، ابھی تک بلی تھیلے سے پوری طرح باہر نہیں آسکی، لیکن اتنا ضرور ہے ڈیڑھ سالہ مضبوط اقتدار کی پیشانی پر پہلی بار پسینہ کے قطرات دیکھے گئے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

قتل وغارت گری، تباہی وبربادی، آتش زنی ودہشت گردی وتخریب کاری، گویا کہ صرف مسلم ممالک اور مسلمانوں کی بلاشرکت غیرے جاگیر بن کر رہ گئی اخبار ہوں یا رسائل، ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن، مجلّات ہوں یا جرائد، انٹرنیٹ ہو یا جدید ابلاغی وسائل، سب کے مطالعہ کے بعد مجموعی تاثر وہی ابھرتا ہے جس کو ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا۔

گویا کہ یہ ممالک اور وہاں کے عوام شب وروز ۲۴/گھنٹے اسی عمل میں مصروف ہیں بموں کی یلغار، دھماکوں کا

تسلسل قتل وغارت گری کا تواتر سب اسی جانب مشیر ہے، اور عالم اسلام کے عوام وحکمرانوں کو ان امور کو انجام دینے کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہیں۔ عربوں اور یمنیوں کی آویزشیں، مصر کے حکمرانوں کا مرسیوں پر ظلم وستم، شام لبنان، پڑوسی ملک پاکستان، افغانستان، برما بنگلہ دیش، فلسطین غرضیکہ عدم استحکام، مار دھاڑ، ہولناک تباہی وبربادی، عالمی طاقتوں کا متفقہ ہدف اور اہم پالیسی کا حصہ ہے، ہر جگہ اپنے ذلیل اور مادّی مفادات کے حصول کے لیے اسلامی ممالک (نام کے ہی سہی) اور عوام کو قربانی کے بکروں کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے اور تو اور خود وطن عزیز میں بھی یہ ہی کچھ دیکھنے کو مل رہا ہے، بے گناہ اور معصوم مسلمانوں سے جیلیں آباد ہیں، گاہے انتظامیہ اپنے سینہ پر تمغوں کے اضافہ کے لیے کسی بڑی مسلم سازش کا انکشاف کرتی ہے، اور گاہے سیاست داں اقتدار کی کرسی کے لیے اس ''خام مال'' کو بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔

اس پورے منظر اور ہولناک داستان میں قابلِ صد افسوس اور لائق ماتم چیز خود ان مسلم حکمرانوں کا عمل اور ایکشن اپنے ہی معصوم عوام کے خلاف ہے، اپنی رعایا سے ہمدردی عوام کی بہبودی اور ان کی کامیابی سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں، یہ دراصل شیطانی قوتوں کے کارندے ہیں جو مسلط کر دیئے گئے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁

بقیہ ۶۳ کا.....

الحاج عبدالرزاق رصاصی کا سانحۂ ارتحال : رصاصی صاحب نیک دل، علم وعلماء دوست، بلند اخلاق، پاکیزہ صفات اور صوم وصلوٰۃ کے انتہائی پابند انسان تھے، مزاج میں تیزی وتندی، قلب مزکّی اور زبان مصفّٰی، دولت پر خود کو بے حد ذمے دار اور امین سمجھتے، ضرورت مند کی تحقیق وتفتیش پہلا مرحلہ اور اطمینان کے بعد کشادہ دستی کی وسعت حیران کن ہوتی۔

سینکڑوں مدارس، انجمنیں، رفاہی تنظیمیں، عصری اسکول، کالجز، پالی ٹیکنک ان کی وسعت قلبی اور فیاضانہ سخاوت کے بل پر رواں دواں تھے۔ مرحوم کے کارِ خیر کے اس قدر شعبے تھے کہ یقین ہے وہ سب ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ہوں گے، انشاءاللہ۔

جامعہ امام محمد انور شاہ کے بانی فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہٗ سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، جو حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات تک قائم رہے۔ طویل عرصہ صاحبِ فراش رہنے کے بعد گذشتہ ماہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جامعہ میں ایصالِ ثواب کے لئے مجلس منعقد کی گئی، حق تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے سرفراز فرمائے۔ آمین

.....✦.....

تفسیر سورۂ نجم

✦ **افادات** : امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

✦ **مرتب** : حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی. سلمویات سے شروع کیا، اس لئے کہ مابعد کا کلام آسمان کی خبر اور اسراء کے متعلق ہے۔ السمٰوٰت العلیٰ تک بلکہ سدرۃ المنتہیٰ تک، یہاں تک کہ فرمایا اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی. یہ خلاصہ ہے ان آیات کا اور موحی بکسر الحاء کو مبہم رکھا کیوں اس کا انحصار اللہ تعالیٰ ہی میں ہے اور وحی رسالت ہی میں ہے اور ذکر کرنا ان اوصاف کا جو کسی موصوف میں ہی منحصر ہوتے ہیں اس موصوف کا نام لینے سے زیادہ ابلغ ہوتا ہے۔ مثلاً قول ان کامررت باکرم القوم پھر فرمایا عَلَّمَہٗ شدید القویٰ پس منتقل ہوئے معلم کی طرف موحی کے ذکر کے بعد اور ان کو دو شمار کیا۔ موحی اور معلّم، پھر اوصاف وہ ذکر کئے جو معلّم وحی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ کلام مکہ والوں کے ساتھ ہے اور مکہ والے جبرئیل علیہ السلام کو پہچانتے نہ تھے۔ پس اس کی صفات اور فعل ذکر فرمائے جیسے سورہ تکویر میں ہے تو یہ تعدیل ہوئی وحی کی سند کی کیوں کہ جب کہا جائے یاتیہ الملک تو جی میں کھٹکتا ہے کہ آنے کی کیا صورت ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ قادر ہے اس پر اور وہ سوی مبارک ہے۔ ذومرّہ ہے، اس جیسے سے خیر ہی کا ایناس ہے اور وہ نزدیک ہوتا ہے اور وہ لٹک آتا ہے، لہٰذا اس کے اوصاف ذکر فرمائے۔ ابن قیم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ذُومرّہ یعنی جمیل المنظر، حسن الصورۃ ہے، جلالتِ شان والا ہے، اقبح صورت والا شیطان نہیں ہے بلکہ وہ اجمل الخلق ہے اور ذی امانت اور مکانت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی وحی نبوت کی تعدیل اور اس کا تزکیہ ہے، جیسے اس کی نظر سورۂ تکویر میں ہے۔ بیان فرمایا وہ علم قدرت والا، جمال المنظر ہے۔ یہ اوصاف رسول ملکی اور بشری دونوں کے ہیں۔

قولہ فتدلّٰی اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اپنے مکان سے تجاوز نہیں کیا۔ یہاں تعلق بھی قائم رہا، جیسے پھل کی تدلی ہوتی ہے کہ تعلق بھی باقی رہتا ہے اور نیچے بھی لٹک آتا ہے۔ جیسے نور عظیم منسبط فی الجوّ ہوتا ہے کہ چھوٹے سے سوراخ سے داخل ہو جائے اس کو ناظر یوں سمجھتا ہے کہ اس کا تعلق اوپر سے ہے۔ منفصل نہیں ہوا، گویا یہ تمثیل اس کی ہوئی جو جبرئیل امین کی بشر کی شکل میں نمودار ہونے کی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کرنا بے موقع نہ

ہوگا، جیسا کہ سُہیلیؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب حضور ﷺ آسمان کی طرف چڑھے، **فَاَوْحیٰ اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی** تو جب حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دنوِ رب محسوس ہوا تو آپ سجدے میں گرے، پس سبحان رب الجبروت والملکوت والعظمۃ کہتے ہی رہے حتی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو وحی کرنا تھا وہ کرلیا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ آپ اپنی اسی خلقت میں ظاہر ہوئے جیسا کہ ان کو پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے پر ملائے ہوئے ہیں (یاقوت اور زبرجد اور لؤلؤ کے) میں نے خیال کیا کہ جبرئیل کی دو آنکھوں کے درمیان کے فاصلہ نے دونوں آفاق کو گھیر لیا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے میں نے ان کو مختلف صورتوں میں دیکھا تھا اور اکثر دحیہ بن خلیفہ کلبی کی شکل میں دیکھا کرتا تھا اور بعض اوقات ایسے جیسے کوئی کسی کو چھلنی میں سے دیکھے۔ **قولہٗ فاوحٰی الٰی عبدہٖ ما اوحٰی** اس کے قریب قریب مسلم شریف میں ہے اور یہ کوئی انتشار فی الضمائر نہیں، کیوں کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے اور رسول تو موحی ہو نہیں سکتا بلکہ مرسل ہی موحی ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا **اَو یرسل رسولاً فیوحی باذنہ ما یشاء** یہاں بھی متعاطفات نہیں بلکہ ایک سلسلہ مرتب ہے۔ بعض بعض سے ملا ہوا ہے جس کی انتہا الی اللہ ہے۔ یہ خلاصہ ہے مضمون کا، جیسا کہ **ان ھو اِلا وحیٌ یوحی** میں استیناف ہوا باعادہ ما استونف عنہ جیسا کہ **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم** میں ہے۔

پھر فرمایا **ما کذب الفواد ما رای** اس کو ماقبل سے جدا کردیا اور عطف نہیں ڈالا کیوں کہ یہ شامل ہے رویت باری تعالیٰ کو فواد سے اور رویۃ جبرئیل کو علیٰ صورتہٖ یہ دونوں قبل الاسرا حاصل تھے اور یہ شامل ہے ان تمام اشیاء کو جو لیلۃ الاسرا میں دیکھیں جیسا کہ فرماتے ہیں **لَقد رایٰ من آیات ربہ الکبریٰ**. اور بنی اسرائیل میں ہے **لنریہٗ من آیاتنا** وہاں یہ بھی فرمایا **و ما جعلنا الرؤیا الّتی اریناک الا فتنۃ للناس**. سو فتنۂ مماراۃ ہی کا نام ہے، جیسے سورۂ نجم میں فرمایا: **اَفَتُمارونہٗ علٰی ما یریٰ** پس **قولہٗ ما کذب الفؤاد ما رای ای ما کذب الفواد عبدنا ما رای ای ھذا العبد** یا تو فواد سے یا آنکھوں سے اور کَذَب متعدی ہے دو مفعولوں کی طرف۔ جیسے ان کا قول **صَدقتَ فُلاناً الحدیث و کَذَبتہ** احتمال ایک مفعول پر مقتصر ہونے کا بھی ہے یعنی **ما قال کذبا ای ھذہ المقولۃ بل قال ما وقع بعد عیانا فی الاسراء بالنسبۃ الی رؤیۃ اللّٰہ تعالیٰ**.

اور یہاں پر رؤیۃ فواد کا ہونا اور مابعد میں رؤیۃ بصر کا ہونا یہ کوئی نظم قرآنی میں انفکاک کا باعث نہیں بلکہ رؤیۃ امر واحد ہے اور فرق جو آتا ہے وہ فاعل کی جانب سے آتا ہے، آثار صحیحہ اور احادیث صحیحہ سے دونوں رؤیتیں ثابت ہیں، رؤیۃ اللہ تعالیٰ کی پہلی فواد سے اور ثانی بصر سے۔ جیسے حدیث بعثت میں ہے کہ واقعہ ہونے سے قبل اس کا رؤیا میں دکھا دیا جانا آتا ہے۔

پھر فرمایا **افتمارونہٗ علٰی ما یریٰ** اور نہ کہا **فیما یریٰ** اس نے دلالت کی کہ یہاں اور..... بقیہ ص پر ۴۷ پر

تاریخ حفاظت قرآن

✦ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ

شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی

زیرِنظر مقالہ میں بتایا جائے گا کہ آں حضرت ﷺ اور آپؐ کے بعد کے زمانوں میں قرآن کریم کی حفاظت کس طرح کی گئی؟ اُسے کس طرح لکھا گیا اور یہ کوششیں کتنے مراحل سے گذری ہیں؟ نیز اس سلسلے میں غیر مسلموں اور ملحدوں کی طرف سے جو شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان کا انشاء اللہ مکمل اور اطمینان بخش جواب دیا جائے گا۔

آں حضرت ﷺ کے زمانے میں حفاظت قرآن : قرآن کریم چوں کہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہد رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کرلیا جائے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں یہ امتیاز عطا فرمایا تھا۔ اس کی حفاظت قلم اور کاغذ سے زیادہ حفاظ کے سینوں سے کرائی، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا **و منزل علیك كتاباً لا يغسله الماء** یعنی میں تم پر ایک ایسی کتاب نازل کرنے والا ہوں جسے پانی نہیں دھو سکے گا۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عام کتابوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ دنیوی آفات کی وجہ سے ضائع ہوجاتی ہیں، چنانچہ تورات، انجیل اور دوسرے آسمانی صحیفے اسی طرح نابود ہوگئے لیکن قرآن کریم کو سینوں میں اس طرح محفوظ کردیا جائے گا کہ اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ (النشر فی القراءات العشر لابن الجزری، ص۶، ج۱)

چناں چہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اس کے الفاظ کو اُسی وقت دہرانے لگتے تھے تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہوجائیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں **لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ** (آپؐ قرآن کریم کو جلدی سے یاد کرلینے کے خیال سے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے (کیوں کہ) اس (قرآن) کو جمع کرنا اور پڑھوانا تو ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔''

اس آیت میں یہ بات واضح کردی گئی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپؐ اسے بھول نہیں سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپؐ پر آیاتِ قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہوجاتیں، اس طرح سرکار دو عالم ﷺ کا سینۂ مبارک قرآن کریم کا سب زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم وتغیر کا امکان نہیں تھا۔ پھر آپؐ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دومرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص۳۶، ج۹)

پھر آپؐ صحابہ کرام کو قرآن کریم کے صرف معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اُس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے اور خود صحابہ کرام کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کرکے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کردی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اُسے دہراتے رہتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرمادیتے تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے اور مسجد نبویؐ میں قرآن سیکھنے اور سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ تاکید فرمانی پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔ (مناہل العرفان، ص۲۳۴، ج۱)

اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے اور انہیں صدیوں تک گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد قرآن کریم کی وہ منزل ہدایت نصیب ہوئی تھی جسے وہ اپنی زندگی کی سب سے عزیز پونجی تصور کرتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے یاد رکھنے کے لئے کیا کچھ اہتمام کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جو اُن کے مزاج اور افتادِ طبع سے واقف ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی تعداد تیار ہوگئی جسے قرآن کریم ازبر یاد تھا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظِ قرآن کی اس جماعت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت ام ورقہؓ، حضرت اُبی بن کعبؓ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوحلیمہ معاذؓ، حضرت

زید بن ثابتؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت مجمع بن جاریہؓ، مسلمہ بن مخلدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عقبہ بن عامرؓ، حضرت تمیم داریؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوزیدؓ جیسے حضرات شامل تھے۔ (النشر فی القراءات العشر، ص۶، ج۱، الاتقان، ص۳۷، ۴۷، ج۱، تاریخ القرآن للکردیؒ، ص۶۰)

پھر تو یہ صرف اُن صحابہ کرام کے اسماء گرامی ہیں جن کا نام ''حافظ قرآن'' کی حیثیت سے روایات میں میں محفوظ رہ گیا، ورنہ ایسے صحابہؓ تو بے شمار ہوں گے جنہوں نے پورا قرآن کریم یاد کیا تھا، لیکن اس حیثیت سے اُن کا نام روایات میں محفوظ نہیں رہ سکا، اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے بعض اوقات ایک قبیلے میں ستّر ستّر قاری قرآن کی تعلیم کے لئے بھیجے ہیں، چنانچہ صرف غزوہ بئر معونہ کے موقع پر ستر قراء صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر روایات میں موجود ہے اور حفاظ صحابہ کی تقریباً اتنی ہی تعداد آپؐ کے بعد جنگ یمامہ میں شہید ہوئی (الاتقان، ص۳۷، ج۱) بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ جنگ یمامہ کے موقع پر سات سو قراء صحابہؓ شہید ہوئے تھے۔ (عمدۃ القاری، ص۱۶، ۱۷، ج۲۰، مطبوعہ دمشق)

اس کے علاوہ یہ تو صرف ان صحابہؓ کا ذکر ہے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا اور ایسے صحابہؓ کا تو کوئی شمار ہی نہیں جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے۔ (البرہان فی علوم القرآن للزرکشیؒ، ص۲۴۱ تا ۲۴۳، ج۱)

غرض ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے بنیادی طریقہ یہی اختیار کیا گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کو یاد کرا دیا گیا، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوسکتی اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، ان کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اس قوتِ حافظہ سے کام لیا گیا اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

اس طریقہ سے قرآن کریم کی نشر واشاعت کس تیزی کے ساتھ ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرو بن سلمہؓ عہد رسالت کے ایک کم سن صحابی تھے، ان کا گھر ایک چشمہ کے کنارے واقع تھا، جہاں آنے والے مسافر آرام کیا کرتے تھے، اُن کی عمر سات سال تھی اور ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن آنے جانے والوں سے قرآن کریم کی مختلف آیتیں اور سورتیں سن سن کر انہیں مسلمان ہونے سے پہلے ہی قرآن کریم کا ایک اچھا خاصا حصہ یاد ہوگیا تھا۔ (صحیح بخاری)

عہد رسالت میں کتابتِ قرآن، پہلا مرحلہ : حفاظت قرآن کا اصل مدار تو اگرچہ حافظہ پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آں حضرت ﷺ نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا۔ کتابت کا طریق کار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ: **کنت اکتب الوحی لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کان اذا انزل علیہ الوحی اخذتہ برجاء شدیدۃ و عرقا مثل الجمان ثم سری عنہ فکنت ادخل علیہ بقطعۃ الکتف او کسوۃ فاکتب وھو یملی علی فما افرغ حتی تکاد رجلی تنکسر من نقل القرآن حتی اقول لا امشی علی رجلی ابدا فاذا فرغت قال اقرأ فأقرہ فان کان فیہ سقط اقامہ ثم اخرج بہ الی الناس.**

''میں رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی تھی اور آپؐ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہوجاتی تو مونڈھے کی کوئی ہڈی (یا کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا۔ بہرحال جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے: پڑھو، میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی، تو آپ اس کی اصلاح فرمادیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔''

کتابت وحی کا کام صرف حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے سپرد نہ تھا بلکہ آپؐ نے بہت سے صحابہؓ کو اس مقصد کے لئے مقرر فرمایا ہوا تھا جو حسبِ ضرورت کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، کاتبینِ وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ حضرات ہیں:

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن سرحؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت خالد بن سعید بن العاصؓ، حضرت ابان بن سعید بن العاصؓ، حضرت حنظلہ ابن الربیعؓ، حضرت معقیب بن ابی فاطمہؓ، حضرت عبداللہ بن ارقم الزہریؓ، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت زید بن ثابتؓ۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔ چنانچہ اسے آپؐ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، اس زمانہ میں چوں کہ عرب میں کاغذ کمیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں اور چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے۔

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آں حضرت ﷺ نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگر چہ وہ کتابی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے جاری تھا، جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اور بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا جس میں سورہ طٰہٰ کی آیات درج تھیں اور حضرت خباب بن ارتؓ انہیں پڑھا رہے تھے۔

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے انفرادی طور پر اپنے پاس قرآن کریم کے مکمل یا نامکمل نسخے لکھ رکھے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ **ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نھی ان یسافر بالقرآن الیٰ ارض العدو** . رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کرنے سے منع فرمایا۔

نیز معجم طبرانی میں ایک روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: **قراءۃ الرجل فی غیر المصحف الف درجۃ و قراءتہ فی المصحف تضاعف علیٰ ذلک الفی درجۃ.**

''کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ میں دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب ایک ہزار درجہ ہے اور اگر قرآن کے نسخہ میں دیکھ کر تلاوت کرے تو دو ہزار درجہ ہے۔''

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پاس عہد رسالت ہی میں قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے، ورنہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کو دیکھ کر تلاوت کرنے یا اسے لے کر دشمن کے علاقہ میں جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جمع قرآن، دوسرا مرحلہ : لیکن آں حضرت ﷺ کے زمانے میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے ان کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، زیادہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صاحب کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے یہ

پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ''عمرؓ نے بھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں، میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آں حضرت ﷺ نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نوجوان اور سمجھ دار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ ﷺ کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہٰذا قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کر کے انہیں جمع کرو۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے ان سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری، ص ۸ تا ۱۱، ج ۹)

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جیسا کہ پیچھے ذکر آ چکا ہے وہ خود حافظ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جا سکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخے آں حضرت ﷺ کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آں حضرت ﷺ نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انہیں یکجا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان ہی سے نقل کیا جائے۔ چنانچہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے اور جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

۱-سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے۔

۲-پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترکہ طور پر اسے وصول کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت زیدؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ بھی اپنے حافظہ سے اس کی توثیق فرماتے تھے۔

۳-کوئی لکھی ہوئی آیت اس وقت قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آں حضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت آں حضرت ﷺ کی وفات کے سال آپؐ پر پیش کر دی گئی تھی اور آپؐ نے اس بات کی تصدیق فرمادی تھی کہ یہ ان حروف سبعہ کے مطابق ہیں جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ علامہ سیوطیؒ کی اس بات کی تائید متعدد روایات سے بھی ہوتی ہے۔

۴-اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا ان مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔ امام ابوشامہؒ فرماتے ہیں کہ اس طریق کار کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے اور صرف حافظہ پر اکتفاء کرنے کے بجائے بعینہٖ اُن آیات سے نقل کیا جائے جو آں حضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ ''سورہ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الخ مجھے صرف حضرت ابوخزیمہ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوخزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں اور ان کے سوا کسی کو ان کا جزوِ قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آں حضرت ﷺ کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے ان میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزوِ قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اول تو جن سینکڑوں حفاظ کو پورا قرآن کریم یاد تھا، انہیں یہ آیات بھی یاد تھیں، دوسرے آیاتِ قرآنی کے جو مکمل مجموعے مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن حضرت زید بن ثابتؓ نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالا ذرائع پر اکتفا کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بیڑا ابھی اٹھایا تھا، اس لئے انہوں نے یہ آیت اس وقت تک اس نئے مجموعہ میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقہ سے بھی وہ

آپ کو دستیاب نہیں ہوگئی۔ دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہؓ کو یاد ہونے اور عہد رسالت کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کئی کئی صحابہؓ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی بھی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کئی کئی صحابہؓ لے کر آرہے تھے، اس کے برعکس سورۂ براءت کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہؓ کو یاد تھیں اور جن حضرات کے پاس آیاتِ قرآنی کے مکمل مجموعے تھے ان کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آں حضرت ﷺ کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوخزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔

بہرحال حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا لیکن ہر سورۃ علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو ''امم'' کہا جاتا ہے اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:

(۱) اس نسخہ میں آیاتِ قرآن تو آں حضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔

(۲) اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے۔

(۳) یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔

(۴) اس میں صرف وہ آیتیں درج کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

(۵) اس کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن سے متعلق یہ تفصیلات ذہن میں رہیں تو اس روایت کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آں حضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت علیؓ نے قرآن کریم جمع کر لیا تھا، اس لئے جہاں تک آیاتِ قرآنی کے انفرادی مجموعوں کا تعلق ہے وہ صرف حضرت علیؓ نے ہی نہیں اور بھی متعدد صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے، لیکن ایسا معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تیار کروایا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق انہیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر مروان بن حکم نے اپنے عہد حکومت میں حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے طلب کئے تو انہوں نے دینے سے انکار دیا، یہاں تک کہ جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہوگئی تو مروان نے وہ صحیفے منگوائے اور انہیں اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور ترتیب سور کے لحاظ سے

حضرت عثمان کے تیار کرائے ہوئے مصاحف کی اتباع لازمی ہے اور کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اُن کے رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمعِ قرآن، تیسرا مرحلہ : جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، اُدھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اسے آں حضرت ﷺ سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اس نے حضورؐ سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز مما لک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز مما لک میں پہنچا اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے کیوں کہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے اُن جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کون سی قراءت صحیح اور کون سی غلط ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس کارنامہ کی تفصیل روایاتِ حدیث کے ذریعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہورہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کا شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو

اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگرد کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ ''مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ''میری رائے یہ ہے کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تا کہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے۔'' صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ''تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور رہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتدا ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت عثمانؓ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی۔ اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کریں جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زید انصاری تھے اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے اُن سے فرمایا کہ ''جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کون سا لفظ کس طرح لکھا جائے) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔''

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، یہاں تک کہ ابن ابی داؤد کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی ہے، جن میں حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت کثیر بن افلحؓ، حضرت مالک بن ابی عامرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل تھے۔ ان حضرات نے کتابتِ قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی لئے ان پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً **مسرها** لکھا تاکہ اسے نَنْشُزُهَا اور نُنْشِزُهَا دونوں طرح پڑھا جا سکے کیوں کہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں۔

(۳) اب تک قرآن کریم کا ایک معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصحف تیار کرائے تھے لیکن ابوحاتم سجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔

(۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سرِ نو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے۔ اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت **مِنَ الْمُؤْمِنِيْنِ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ** علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی۔ پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیوں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأ بها، فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصاريؓ."

"مجھے مصحف لکھتے وقت سورۂ احزاب کی آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت اُن مصاحف میں اس وقت نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام نسخے نذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط مسلمہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمانؓ کے اس کارنامہ کو پوری امت نے بہ نظر استحسان دیکھا اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں ان کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش ہوئی تھی جس کے اسباب ''سبعۃ احرف'' کی بحث میں گزر چکے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''**لا تقولوا فی عثمانؓ الا خیراً فواللّٰہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملأ منا.**

''عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیوں کہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا ہے وہ ہم سب کی موجودگی میں اور مشورہ سے کیا ہے۔''

حج کے روحانی واقتصادی پہلو

✦ مولانا محمد مزمل صاحب بدایونی
استاذ دارالعلوم دیوبند

یہ صحیح ہے کہ شریعت کا ہر حکم اپنے اندر کوئی نہ کوئی مصلحت وحکمت رکھتا ہے بلکہ بعض احکام ایک سے زائد حکم و مصالح سے پر ہوتے ہیں اور ہونا ہی چاہئے کہ شریعت حکیم مطلق اور قادر وجبار کا عطیہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ ''حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا'' تو خالق حکماء کا فعل مصالح سے کیوں کر خالی ہوسکتا ہے۔ علماء شریعت نے احکام شرعیہ کی مصلحتوں کو واضح بھی کیا ہے، مستقل اسی موضوع پر ضخیم کتابیں بھی لکھی ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی مصلحت جانی ہی جائے، پھر اگر جاننے کی کوشش بھی کی جائے تو ضروری نہیں کہ عقل و دانش میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہو، اس لئے کہ وحی ورسول آتے ہی ان چیزوں کو بتلانے کے لئے ہیں جہاں عقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ یہ زمانہ کثرت جہل بلکہ جہل مرکب میں ابتلاء کا ہے، علم سے یا تو واسطہ ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو سطحیت دامن گیر ہے، گہرائی وگیرائی کا فقدان ہے، اکثر عوام کا حال یہ ہے کہ عصری فنون کو ہی علم سمجھے ہوئے ہیں اور وہ اہل فن اس قدر نخوت وتکبر میں مبتلا ہیں کہ مصادر شریعت سے یکسر نابلد ہونے کے باوجود احکام شرعیہ اور ان کے مآخذ میں رائے زنی کرتے ہیں، نہ صرف یہ کہ احکام کی مصلحتیں اور حکمتیں دریافت کی جاتی ہیں بلکہ علتوں کے بارے میں بھی سوال کئے جاتے ہیں اور یہ مرض اتنا عام ہے کہ کسی کو بھی اس کے بغیر تشفی نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہیں، ہمارے ذہن سے یہ بات اوجھل ہے کہ ہم خاکی ہیں، ناپاک نطفے سے پیدا ہوئے ہیں، ہم عبودیت کے پتلے اور غلام ہیں، ہم مملوک ہیں اور ہمارا مالک یہ احکام ہم کو دے رہا ہے، ہم علتوں اور حکمتوں کا سوال کرتے وقت یہ خیال ذہن میں لانے سے قاصر رہتے ہیں کہ مالک کے حکم کی علت دریافت کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں ہے، وہ تو اس شان کا ہے کہ ''**لا یسأل عما یفعل وھم یسئلون**''

تاہم ان بیمار دماغوں کی تسکین کے لئے علماء کرام لائق تحسین کوششیں کرتے رہے ہیں جب کہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں تھی، اس لئے کہ علت وحکمت کا بیان کرنا قانون بنانے والے کے ذمہ ہے اور علماء تو ان قوانین کو عوام کے سامنے بیان کرنے والے ہیں لیکن علماء عظام نبی کی شفقت کے حامل ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو راہِ راست سے

بھٹکتے کیسے دیکھ سکتے ہیں، اسی جذبے کے تحت انہوں نے بیمار ذہنوں کو شفاء فراہم کرنے کی ذمہ داری اپنے سر اوڑھ ہی لی ہے۔انہوں نے ایک ایک حکم شرعی کی مصلحت تلاش کر کے بیان کی ہے۔

احکامِ شرعیہ میں سے ایک اہم ترین حکم حج کا ہے، جس کی بابت شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ:

''حج وعمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں رہتا ہے اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔'' (جمع الفوائد، کتاب الحج ۱/۲۳، طمیرٹھ)

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپؐ نے یہ بشارت دی کہ:

''عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں، جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو انہوں نے مانگا وہ ہم نے دے دیا۔''

ان کے علاوہ بھی بے شمار حج کی فضیلتیں روایات میں وارد ہیں، علماء اسلام نے حج کے اسرار وحکم سے بھی بحث کی ہے اور تفصیل سے ان پر روشنی ڈالی ہے، جن میں سے چند قارئین کی خدمت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

توبہ و انابت: توبہ کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا مقام ہے، نبی اکرم ﷺ کی زبانی یہ مژدہ سنایا گیا کہ:

''گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کے جیسا ہو جاتا ہے جس کا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔'' (سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ)

توبہ کسی خاص مقام اور وقت کے ساتھ مشروط نہیں، وہ کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت کی جاسکی ہے۔حرم، کعبہ اور عرفات کی کوئی تخصیص نہیں ہے، تاہم حج مبرور درحقیقت توبہ وانابت سے عبارت ہے اور اس سے حاجیوں کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے مخصوص فوائد وبرکات (جو کسی دوسرے مقام پر نہیں) کے ساتھ ساتھ اپنے ایسے اثرات بھی رکھتے ہیں جو صدق دل سے توبہ کرنے کے لئے بہتر سے بہتر مواقع پیدا کرتے ہیں، ان کے مقامات کا ایک خاص تقدس اور عظمت مسلمانوں کے قلوب میں ہے اس کا نفسیاتی اثر دل پر بہت گہرا پڑتا ہے، یہاں لوگوں کا اجتماع ہے، آہ وزاری، نالہ وفریاد کا بازار گرم ہے، انسان کے ذہن میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال کے لئے دعاء مانگی ہے، یہاں ہزاروں برگزیدہ بندوں کے اپنے رب سے راز ونیاز کے معاملات ہوئے ہیں، یہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی امت کے لئے دعائیں کی ہیں اور قبول ہوئی ہیں، یہ وہ خیالات ہیں جو پتھر سے پتھر دلوں کو بھی موم بننے کے لئے تیار کر دیتے ہیں اور وہ ان مقامات ومشاہد پر ایسا نالہ بھرتے ہیں کہ اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو ہی جاتے ہیں، جو وقتاً فوقتاً یہاں مقربین الٰہی پر عرش الٰہی سے برستا رہتا ہے۔

حج زندگی میں انقلاب کا باعث : بار بار تجربہ ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی میں کسی خاص مرحلے پر تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے وہ ایک خاص موڑ پر پہنچ کر اپنی پچھلی زندگی چھوڑ کر نئی زندگی شروع کرتا ہے، کوئی ازدواجی زندگی سے منسلک ہونے کے بعد کوئی صاحب اولاد ہونے یا تعلیم سے فراغت ہونے کے بعد، کوئی نوکری یا کسی بڑی کامیابی کے حصول کے بعد، یہ تغیر قبول کرتا ہے، اسی طرح حج بھی اپنے انجام دینے والوں کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان حدِ فاصل کا کام کرتا ہے اور زندگی کو اصلاح کی جانب پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، جہاں انبیاء کرام اور خاصانِ خدا کھڑے ہوئے وہیں پر کھڑے ہو کر حاجی اپنی پچھلی کوتاہیوں پر ندامت، اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت و فرماں برداری کا جب وعدہ کرتا ہے تو وہ وعدہ اس کو پاک و صاف کر کے شر سے خیر کی طرف اس کا ایسا رخ پھیر دیتا ہے کہ زندگی کا دوسرا باب کھل جاتا ہے بلکہ اس کی از سر نو ولادت ہوتی ہے، اسی لئے خالق دو جہاں نے اپنے پیغام بر کی زبانی یہ پیغام پہنچایا کہ:

''جس نے خدا کے لئے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور گناہ نہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسا اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا۔'' (صحیحین، کتاب الحج)

حج اور احساسِ ذمہ داری : جب انسان اپنے اہل و عیال کے نفقے کی ادائیگی کر چکا ہوتا ہے، قرض کے بوجھ سے سبک دوش ہو چکا ہوتا ہے مکہ تک کی آمد و رفت اور اس مدت تک کے اہل و عیال کے خرچے کا نظم کر لیتا ہے، اس وقت حج فرض ہوتا ہے، اس سے ایک حاجی کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس سفر حج پر روانگی سے پہلے ہی ہو جاتا ہے اور اس کا معاملات پر نہایت عمدہ اور گہرا اثر پڑتا ہے۔

حج معاشرتی و اخلاقی اصلاح کا ذریعہ : انسان کے روزمرہ کی زندگی اور دنیوی امور میں بسا اوقات دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں، باہم کچھ نہ کچھ تلخیاں تو ہو ہی جاتی ہیں بلکہ کبھی کبھار تو قطع رحمی تک نوبت پہنچ جاتی ہے لیکن جب بندہ بارگاہِ ایزدی میں حاضری کا ارادہ کرتا ہے تو بغض و حسد اور عناد و کدورت سے اپنے دل کو صاف کرنا چاہتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج انسان کی معاشرتی و اخلاقی اصلاح کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔

اس کے علاوہ حج اسلام کی عالمگیر اخوت، امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا کے درمیان مساوات جیسی بے شمار مصلحتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

حج کا اقتصادی پہلو : حج کوئی اسلام کی نئی ایجاد نہیں ہے، زمانہ جاہلیت بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہی کچھ کمی و زیادتی کے ساتھ حج ہر زمانے میں انجام پاتا رہا ہے، اسلام سے قبل حج اپنے روحانی فیوض و برکات کے علاوہ اقوام عالم کی تجارتی نمائش گاہ اور بین الاقوامی تجارتی میلے کی حیثیت رکھتا تھا،

سوداگر اشہرِ حُرم کے مامون زمانے میں عرب ہی نہیں بلکہ دیگر خطوں سے بھی آتے اور مکہ میں قیام کر کے سال بھر کی روزی پیدا کرتے تھے، اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درج ذیل دعا اور اس کی مقبولیت کا مشاہدہ فرمائیں:

''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں میں سے روزی دے۔'' (بقرہ)

''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے عزت والے گھر کے پاس اس لئے بسائی ہے کہ نماز کو قائم کریں تو انسانوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تا کہ وہ شکر گذار ہوں۔'' (ابراہیم)

حجاج کی آمد و رفت اور ان کی تجارتی گرم بازاری کیا اس لئے بھی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ اس ویرانے کی مالی آبادی کا سامان ہو؟

حج کے اقتصادی پہلو کو واضح کرنے کے لئے اس لحاظ سے بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں: زراعت، صنعت اور مویشی کی پرورش۔ عربوں کے پاس زراعت نہیں اور نہ ہی صنعت ہے، ان کی دولت کا سرمایہ صرف جانوروں کی پرورش ہے۔ اب ان جانوروں کی کھپت کے لئے بازار چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ نے قربانی کو مقرر کر کے اس کا کیسا عمدہ نظم فرما دیا، آپ اندازہ کیجئے کہ لاکھوں حاجی ہر سال حج کرتے ہیں اور ہر حاجی کم از کم ایک قربانی تو کرتا ہی ہے جبکہ بعض دیگر دو دو اور تین تین قربانیاں بھی کرتے ہیں، پھر ان کا گوشت، پوست اور ہڈیاں بھی انہیں کے ہاتھوں میں رہتی ہیں اور سب کی قیمت بازار میں موجود ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تہہ میں جاتے رہئے کہ:

''اللہ تعالیٰ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔'' (حج)

علاوہ ازیں پٹرول کی دریافت سے پہلے زمانے کو ذہن میں رکھئے یا فرض کر لیجئے کہ خدانخواستہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی کسی مصلحت غامضہ کے تحت تیل اور پٹرول کے سوتوں کو خشک کر دیں تو عربوں کے لئے ذریعہ معاش کیا ہوگا؟ کیا حج ان کے لئے سال بھر گزارنے کا سامان فراہم کرنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ اب بھی عربوں کا ایک بڑا طبقہ موسمِ حج میں ہی پورے سال کے مصارف بہ آسانی فراہم کر لیتا ہے۔ حاجیوں سے مکان کا کرایہ، ان کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری اور باربرداری کی اجرت اور دوسرے کتنے ہی ذرائع ہیں جو عربوں کو ایک خطری رقم سال بہ سال فراہم کرتے ہیں۔

.....✦.....

قربانی کی حقیقت اور پس منظر

✦ مولانا مفتی محمد ساجد صاحب
استاذ جامعہ ہذا

قربانی کی حقیقت : قربانی، قرب سے بنا ہے۔ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مخصوص عمر کے چوپایوں کو جن کی شریعت نے اجازت دی ہے مخصوص ایام میں اللہ سے قربت حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کرنے کو قربانی کہتے ہیں۔

اگر ہم فکر کا دریچہ کھولیں اور قربانی کی حقیقت کو پوری طرح شرح وبسط کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو ہمیں سمجھ میں آجائے گا کہ شریعت نام ہے ماننے کا، کسی عمل یا کسی وقت یا کسی جگہ سے شریعت یا ثواب کا کوئی تعلق نہیں اسی کی ایک نظیر قربانی ہے کہ اگر آپ چاہیں قربانی کا ثواب ایام مخصوصہ یعنی ۱۰/۱۱/۱۲/ذی الحجہ کے علاوہ کسی اور دن حاصل کرلیں تو آپ ایک نہیں بلکہ ایک ہزار یا اس سے بھی زائد جانور ذبح کردیں اور اللہ کے راستے میں صدقہ کردیں، فقیروں کو کھلا دیں، مسکینوں میں بانٹ دیں پھر بھی اس کو قربانی نہیں کہا جاسکتا۔

قربانی کی خصوصیت : شریعتِ محمدیؐ میں تمام عبادتوں کا متبادل موجود ہیں جو ان کے اوقات کے علاوہ میں بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرض نماز کے علاوہ نوافل جب چاہیں پڑھ سکتے ہیں اجازت ہے، رمضان کے علاوہ میں جب چاہیں نوافل کے روزے رکھ سکتے ہیں گنجائش ہے، زکوٰۃ واجبہ کے علاوہ جتنا چاہیں نفلی صدقات کرسکتے ہیں مواقع ہیں لیکن اسلام میں دو عبادتیں ایسی ہیں کہ جو ایام متعینہ کے علاوہ میں ادا نہیں کی جاسکتیں۔ (۱) حج (۲) قربانی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں عبادتیں ماہ ذی الحجہ کی آغوش میں ہیں، جس کی خود ایک فضیلت اور امتیازیت ہے۔ خیر مجھے تو یہاں قربانی کی خاصیت بتانی ہے۔

قربانی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اللہ نے اس کے لئے ایام اور اوقات متعین کردیے جن کے علاوہ میں اس کام کو اگر کوئی اس سے عمدہ طریقے سے ادا کرلے تو بھی قربانی کا نام حاصل نہیں کرسکتا، خواہ وہ نفلی ہی کیوں نہ ہو لیکن انہیں ایام میں کرنا شرط ہے۔ اسی قید اور ضبط کی بناء پر اللہ نے اس کا اجر وثواب بھی خوب بڑھا رکھا ہے چنانچہ ترمذی اور دیگر سنن کی کتابوں میں اس عمل کو اللہ کا سب سے پیارا اور محبوب عمل کہا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ قربانی کے دن ابن آدم کا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کو جانور کی قربانی کرنے سے زیادہ پسندیدہ نہیں ہے اور خون بہانے کا عمل اللہ کو اتنا پسند ہے کہ آخرت میں اس کو واپس لوٹانے کے ساتھ دنیا میں ہی خوش خبری اور بشارت سناتا ہے کہ خون زمیں پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں قربانی مقبول ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خوش دلی سے یہ فریضہ انجام دو۔ یہ جانور قیامت کے دن اپنی سینگ بال کھال اور کھر سمیت واپس آئے گا۔

دنیاوی انعام : جب اللہ نے اسے قبول کر لیا اور بشارت بھی سنا دی اور ذات باری تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے، اسے کسی کے گوشت اور ہدیہ کی کیا ضرورت وہ خود سب سے بڑا دین داتا ہے ساری مخلوق کو کھلا رہا ہے، پلا رہا ہے۔ ہمارے اس مقبول عمل پر ہمیں کیوں نہ کھلاتا اور پلاتا چنانچہ اس نے اعلان کر دیا **لن ینال اللّٰہ..... الیٰ..... و بشر المحسنین** (سورہ الحج، آیت ۳۷) اللہ کو نہ تو تمہارا گوشت چاہئے نہ اس کا خون، اللہ کو تو صرف تمہارا تقویٰ اور دل کی شفافیت چاہئے تھی جو مل گئی، اب اس کے بدلے ہم نے اس کو تمہیں دیا خود بھی کھاؤ، دوسروں کو بھی کھلاؤ۔

ایک چیز ہم نے شروع میں کہی تھی کہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کی نیت سے قربانی ہونی چاہئے کیوں کہ اصل تو نیت اور خلوص ہی ہے، اس کی سچائی اور صداقت پر ہی اعمال کے ثواب مرتب ہوتے ہیں جس طرح نیت ہوگی برکت بھی ویسی ہی ہوگی۔ قربانی میں نیت کس درجہ خالص ہونی چاہئے اور کتنا رضاء الٰہی کا منشاء پیش نظر ہونا چاہئے، اس کو سمجھنے کے لئے قربانی کے پس منظر پر ایک نظر ڈالنا مفید ثابت ہوگا۔

قربانی کا پس منظر : اللہ کے رسولوں میں سے ایک بڑے رسول حضرت ابراہیمؑ گذرے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ سے دوستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ان کا لقب ہی خلیل اللہ (اللہ کا دوست) پڑ گیا اور تمغہ ہے، کیوں نہ ملتا اس خلیل نے اپنے جلیل کی رضا کی خاطر بچپن سے لے کر جوانی تک، جوانی سے لے کر بڑھاپے تک ہر حکم کی تعمیل ایسی کی کہ ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے، کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

قوم سے بغاوت نمرود جیسے جابر و ظالم حکمراں سے اس کے محل میں تنہا مناظرہ، بتوں کی بے خوف و خطر دھنائی، نار نمرود میں خاموشی کے ساتھ داخلہ، امتحان پر امتحان دیتے گئے، بڑھاپے میں ۸۰/۹۰ سال کی عمر میں اولاد نصیب ہوئی، حکم ہوا بے آب گیاہ وادی میں ماں اور بچہ کو چھوڑ آؤ! چھوڑ دیا۔ بچہ پھر جب دوڑنے کے قابل ہوا، باپ کی انگلی پکڑ کر دوڑنے لگا، گھر کی رونق کو چار چاند لگانے لگا، اسی دوران امتحان کا ایسا انداز سامنے آیا کہ تمام عالم کی نگاہیں اس کو پڑھ کر، سن کر خیرہ رہ گئیں، عقلیں حیران و ششدر ہو گئیں۔ آیئے اس عجیب و غریب امتحان کو قرآنی آیات کے ذیل میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن کہتا ہے: **فلما بلغ معه السعی قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تری** اے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا

ہوں،اب بتا تیری کیارائے ہے۔جواب سنیں چھوٹے سے بچے کاقال یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی انشاء اللّٰہ من الصابرین. اے ابوجان جوحکم آپ کوملا ہے بلا پس وپیش کرگذریں،انشاءاللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ میں آپ سے مزاحمت نہیں کروں گا۔ باپ نے بیٹے کولٹا دیا، چھری تیز کرلی، دونوں کے دل فیصلے خداوندی پر مطمئن ہیں اورذبح کی تیاری صدق دل سے ہوچکی ہے۔قرآن کہتا ہےفلما أسلما و تلّه للجبین پھر جب باپ اور بیٹے راضی ہوگئے اور ایک بوڑھے باپ نے اپنے اکلوتے لڑکے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا اور چھری گردن پر چلادی تو کیا ہوا؟ناديناه أن يا ابراهيم قد صدقت الرؤيا كذلك نجزی المحسنين. اللہ کہتا تو ہم نے اس بوڑھے باپ کو جو ہماری محبت اور دوستی میں اپنے بڑھاپے کی لاٹھی کوقربان کرنے لگاپکارااور آواز دی اے(میرے پیارے)ابراہیم تونے خواب سچ کردکھایا(تو بڑااچھا ہے دوستی میں پکا،نیت کا سچا ہے)اور ہم ایسے نیک بندوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں (اور بدلہ وانعام کیوں نہ دیا جائے) یہ امتحان بڑی واضح اور کھلی ہوئی آزمائش تھی جس میں فیل کاامکان غالب تھا،لیکن تم نے اپنے خلوص اورصدق نیت سے ایک نمبر کی کمی تو دور کی بات ایک پوائنٹ کی بھی کمی نہ چھوڑی،اس لئے ہم نے تمہیں سردست دنبہ کا گوشت دیا اور تمہارے لاڈلے کو بچالیا۔ قرآن کہتا ہے و فديناه بذبح عظيم یہ دنبہ حضرت جبرئیل جنت سے لائے تھے جس کی سینگ بیت اللہ میں یزید کے زمانہ تک باقی تھی۔ یہ نقد انعام تھا لیکن اللہ تعالیٰ بھی جس امتحان کو بڑا کہیں عظیم بتائیں اس کا انعام صرف ایک دنبہ بھلے ہی جنت کا ہوانعام پانے والے کے لئے کافی تو ہوسکتا ہے پر دینے والے کے شان سے بہت ہی کمتر تھااس لئے آگےفرمایاو تركنا ه فی الآخرين اے محبوب جاؤ یہ عمل بعد میں آنے والوں میں باقی رکھوں گااور تمہاری یہ سنت اپنی محبوبیت کی دلیل بنالوں گااور قیامت تک تمہارا یہ عظیم کارنامہ تمہارے نام سے جاری وساری کردوں گااور ہوا بھی یہی۔

قربانی کیا ھے ؟ قربانی کا یہ حیرت ناک عمل یعنی جانور کا ذبح دیکھ کرصحابہؓ نے اپنے محبوب جناب محمد ﷺ سے سوال کیاماهی الأضاحی یارسول اللّٰه اے اللہ کے رسول یہ قربانی کیا ہے؟جانوروں کوذبح کردیا جاتا ہے،اس کی حقیقت کیا،آپ نے جواب دیاسنة أبیکم ابراهیم تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے جس کی جھلک اوپر بیان ہوئی۔صحابہ نے پھرسوال کیافما لنا فيها يارسول اللّٰه اس میں ہمیں کیاملتا ہے،کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ظاہری بات ہے سوال دنیا کا نہ تھا کیوں کہ گوشت اور کھال سب کچھ مل جاتا تھا آپ نے منشا سوال سمجھ کر جواب دیابکل شعر حسنة ہر بال کے بدلے ایک نیکی ہے،اب کچھ جانور ایسے بھی تھے جن میں بال نہیں اون ہوتا ہے،تشویش ہوئی تو سوال کا سلسلہ مزید آگے بڑھا۔لوگوں نے پوچھافالصوف يارسول اللّٰه اوراون کا کیا ہوگا اے اللہ کے نبی؟ آپ نے جواب دیابکل شعرة من الصوف حسنة اون کے بدلے بھی ایک نیکی ہے۔سبحان اللہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔خدایا اپنی رحمتوں سے ہمیں محروم نہ کرنا۔

قربانی کے احکام و اقسام : قربانی کے فضائل جاننے کے بعد ایک بات میں بطور مزید فیہ کے عرض کردوں شاید ہمارے کام کی بات ہو۔قربانی کی دو قسمیں ہیں: (۱) واجب (۲) نفل۔

پھر واجب کی تین قسمیں ہیں؟ (۱) جو فقیر اور مال دار دونوں پر واجب ہوتی ہے۔نذر یعنی کسی نے اگر اللہ کے لئے یوں ہی یا کسی کام کے ہو جانے پر قربانی کرنے کو کہا تو یہ قربانی واجب ہوگی، کہنے والا فقیر ہو یا امیر۔

(۲) جو فقیر پر واجب ہے مالدار پر نہیں۔قربانی کے لئے خریدا ہوا جانور اگر کسی فقیر نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تو اب اس پر اسی جانور کی قربانی واجب ہے۔نذر کے درجے میں گویا کہ اس نے یہ کہا کہ میں یہ جانور اللہ کے راستے میں قربانی کروں گا لہٰذا یہ بھی واجب ہوگا۔

(۳) اگر امیر خرید لے تو اس پر خریدنے سے واجب نہیں ہوگا، بلکہ اس پر تو نعمت اور دولت کا شکرانہ واجب ہے جو اللہ نے نوازا ہے اور واجب کی یہی تیسری قسم ہے جو امیر مالدار پر واجب ہوتی ہے۔فقیر پر نہیں، اس کا مقصد صرف نعمت کا شکرانہ سنت ابراہیمی کا احیاء اور شریعت محمد کی اتباع ہے۔ چنانچہ جس کسی کے پاس اتنا مال ہو جو ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی میں سے کسی ایک کی قیمت کو پہنچ جائے بشرطیکہ وہ سامان حوائج اصلیہ میں نہ ہوں تو اس پر قربانی واجب ہے۔

رہی بات نفلی قربانی کی تو وہ مسافر کی قربانی ہے یا اس غریب کی قربانی ہے جو نصاب مذکور کا مالک نہ ہو۔اسی طرح نہ نذر مانی ہو اور نہ ہی قربانی کی نیت سے جانور خریدا ہو۔اب اگر ایسے لوگ قربانی کریں تو یہ نفل ہوگی۔

اگر اب ہم خلاصہ کریں تو قربانی کی اہمیت اور مشروعیت کے ساتھ جو بات سب سے اہم ہے وہ صدق نیت ہے۔چنانچہ قرآن نے **ولکن یناله التقویٰ منکم** کہا کہ تمہاری نیت اللہ کے یہاں پہنچتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی کہا **فطیبوا بها نفسا** خوش دلی سے قربانی کرو۔ابراہیم نے بھی صدق نیت سے قربانی کی۔قرآن کہتا ہے **قد صدّقت الرویا** یعنی اس میں کوئی بناوٹ، ریاکاری کی آمیزش نہیں تھی بلکہ سچائی ہی سچائی، خلوص ہی خلوص، وفاء ہی وفا کا پیغام تھا۔

آخری بات : شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے، ہر طرح سے ہمارے خسارے اور ٹوٹے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ہمارے اعمال کے راستے میں مختلف طریقے سے رہزنی کرتا ہے اور اس کے ڈاکہ زنی کا سب سے پسندیدہ محل دل ہے، وہ اس کے اندر ذرا سی آمیزش کر کے ہمارے جذبے اور خلوص کو کالعدم کر دیتا ہے۔اس لئے چاہئے کہ ہم صرف اور صرف اللہ کی خاطر قربانی کریں اور اس کے علاوہ جو دیگر مقاصد ہیں جن سے ہماری نیتوں میں فتور آتا ہے، گوشت کھانا معاشرہ میں نام و نمود کا حاصل ہونا یا بچوں کو محتاجگی کے احساس سے دور رکھنا یہ سب حاصل ہو جائیں گے۔اگر ہم صدق نیت سے قربانی کریں۔ .....✦.....

بارش کی کمی.....لمحۂ فکریہ

✦ مولانا سید احمد ومیض ندوی

ملک کے مختلف علاقوں میں امساک باراں کی تشویش ناک صورت حال نے ہر شخص کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جون ہی سے بارش میں ۲۱ رفیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے فصلیں خراب، جانور پریشان اور درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ محکمہ موسمیات کے مطابق آئندہ بارش میں تیزی کا کوئی امکان نہیں۔

بارش کی کمی زلزلوں کی کثرت، طوفانِ باد و باراں اور اس طرح کے دیگر سماوی آفات میں انسانی اعمال کا بڑا دخل ہوتا ہے، اس لئے کہ کائنات کی ساری قوتیں حکم خداوندی کے تابع ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ اگر چہ انسانوں کے بہت سے برے اعمال کو درگزر فرماتے ہیں لیکن انسانوں کی تنبیہ کے لئے اکثر بارش کی کمی یا زلزلوں کی کثرت، یا اسی طرح کے سماوی وارضی آفات کے ذریعہ چوکنا کیا جاتا ہے، اس طرح کی آفات میں اعمال کی تاثیر کی طرف قرآن وسنت کے اندر بیسیوں مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ. ''بحر و بر میں بگاڑ لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔ (الروم)

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ.

''جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچتی ہے وہ دراصل تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔'' (الشوریٰ)

قرآن مجید میں جہاں انسانوں کے برے اعمال سے پیدا ہونے والے برے حالات ومشکلات کا ذکر ہے وہیں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ انسانوں کے اچھے اعمال سے اللہ تعالیٰ دنیا کو آفات سماوی سے محفوظ فرماتے ہیں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ.

''اور اگر گاؤں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔'' (الاعراف)

احادیث میں بھی مختلف گناہوں کے مختلف منفی اثرات اور آلام ومصائب کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک

روایت میں آپ ﷺ نے مہاجرین کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے مہاجرین! میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم پانچ قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو جاؤ، پھر آپ ﷺ نے ان برائیوں کے دنیوی اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: جس قوم میں بے حیائی اور فحاشی عام ہوگی اور کھلے عام اس کا ارتکاب کیا جانے لگے گا، اس قوم میں طاعون اور ایسی متعدی بیماریاں پھیل جائیں گی جن کا پچھلے لوگوں میں نام ونشان تک نہ ہوگا اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی اللہ تعالیٰ اسے قحط سالی اور اناج کی قلت میں مبتلا کرے گا اور جو قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے گی اس سے بارش روک لی جائے گی، اگر چوپائے نہ ہوں تو بالکل ہی بارش نہ ہو اور جو قوم بدعہدی کی مرتکب ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ ایسے دشمن کو مسلط کرے گا جو اس سے اس کا مال ومتاع چھین لے گا اور اور جس قوم کے حکمراں خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں، اللہ تعالیٰ اس قوم کو اختلافات اور انتشار میں مبتلا کر دے گا۔ (ابن ماجہ)

حدیث بالا میں پانچ قسم کی برائیوں کے دنیوی اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں فرمایا گیا: **ان الرجل لیحرم الرزق بالذنب یصیبہ** (مسند احمد)

''بندہ اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

''نیز ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس قوم میں زنا اور سود عام ہوتا ہے اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔'' (مسند ابو یعلی)

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''جب میری اطاعت کی جاتی ہے تو میں بندوں سے خوش رہتا ہوں اور جب میں خوش رہتا ہوں تو بندوں کو برکت دیتا ہوں اور میری برکت کی کوئی انتہا نہیں اور جب گناہوں کے ذریعہ میری نافرمانی کی جاتی ہے تو میں بندوں سے ناراض ہوتا ہوں اور جب ناراض ہوتا ہوں تو بندوں پر لعنت کرتا ہوں اور انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہوں۔'' (مسند احمد)

نیز زنا کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ ''زنا فقر وفاقہ کو جنم دیتا ہے۔'' (بیہقی)

ایک اور روایت میں فرمایا گیا کہ ''جب زنا عام ہوتا ہے تو فقر وافلاس اور محتاجی عام ہوتی ہے۔ (مسند بزار)

ایک مرتبہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ام المؤمنین! ہمیں زلزلہ کے سلسلے میں بتایئے کہ اس کے کیا اسباب ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جب لوگ زنا کو حلال کر لیں اور شراب نوشی کرنے لگیں اور گانا بجانا عام ہو جائے تو آسمان میں خدا کی غیرت جوش میں آتی ہے اور اللہ تعالیٰ زمین کو حکم کرتے ہیں کہ وہ حرکت کرنے لگے، پھر جب بندے توبہ کرتے ہیں اور ان گناہوں سے باز آجاتے ہیں تو معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے، ورنہ زمین کو ان پر منہدم کر دیا جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا یہ زلزلہ اہل زمین کے لئے عذاب کے طور پر لایا جاتا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے

فرمایا،نہیں! یہ مسلمانوں کے لئے رحمت اور درس عبرت اور کافروں کے لئے عذاب اور خدا کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے۔(الجواب الکافی لابن قیم الجوزیہ)

بارش کی کمی بھی دراصل ہمارے اعمال کا وبال ہے، ویسے ہر قسم کے گناہ بارانِ رحمت کے لئے رکاوٹ بنتے ہیں لیکن احادیث میں دو قسم کے گناہوں کو بارش کی رکاوٹ کا اہم سبب قرار دیا گیا ہے۔(۱) زکوٰۃ ادا نہ کرنا (۲) ناپ تول میں کمی کرنا۔

ترکِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں فرمایا گیا: **ما منع قوم الزکوۃ الا حبس اللّٰہ عنھم المطر** (ابن ماجہ)

جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی اللہ اس کو قحط میں مبتلا کرے گا۔ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی اور ناپ تول میں کمی دونوں برائیاں مسلم معاشرہ میں عام ہیں، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے۔ اکثر دیہات کے مسلمانوں میں زکوٰۃ کا تصور ہی نہیں ہے۔ بعض کاشت کار اور کسان صاحب نصاب ہونے کے باوجود اپنی آمدنی اور پیداوار میں زکوٰۃ نہیں نکالتے، بارش کی قلت سے ویسے سب ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، لیکن کسانوں کا طبقہ بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہی طبقہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں سخت کوتاہی کرتا ہے۔ جہاں تک ناپ تول میں کمی کا تعلق ہے تو اس گناہ کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں دسیوں مقامات پر ناپ تول میں کمی سے تاکید کے ساتھ روکا گیا ہے اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے تباہی اور ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے توحید کی دعوت کے ساتھ جن سماجی برائیوں سے بچنے کی سختی سے تاکید فرمائی ہے ان میں ایک ناپ تول میں کمی کی برائی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں یہ مرض بہت عام تھا، قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت شعیب کی دعوت کا ذکر آیا ہے وہاں ناپ تول میں کمی کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی سودا فرخت کرتے ہوئے ڈنڈی مارے گو کہ یہ بھی ناپ تول میں کمی کی ایک صورت ہے لیکن ناپ تول میں کمی اسی حد تک محدود نہیں، بلکہ صاحب حق کو حق کی ادائیگی میں کسی بھی طرح کی کوتاہی ناپ تول میں کمی کہلائے گی۔ اس وسیع مفہوم کی روشنی میں معاشرت کی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے تو سارا معاشرہ مخدوش نظر آتا ہے، حق تلفی آج مسلم سماج میں اس قدر عام ہے کہ دین دار طبقہ بھی اس سے محفوظ نہیں۔

بارش کی کمی کے اس خدائی عذاب سے بچنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے ہر طرح کے گناہوں سے سچی توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع ہونا چاہئے، توبہ واستغفار خدا کے غضب کو ٹھنڈا کرنے اور اس کی رحمت کو متوجہ کرنے کا موثر ذریعہ ہے، جب کہ توبہ کے شرائط وآداب بھی ملحوظ رکھے جائیں۔ پچھلی اقوام میں جب قحط سالی اور بارش کی کمی ہوئی تو انبیاء کرام نے اپنی قوموں کو استغفار اور انابت الی اللہ کی دعوت دی، چنانچہ حضرت نوح علیہ الصلاۃ والسلام

کی قوم شدید قحط سالی سے دوچار ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کو شرک و معاصی سے توبہ کرنے اور اللہ سے استغفار کرنے کی تلقین کی اور انہیں یقین دلایا کہ استغفار اور توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم پر بارش برسائے گا اور باغات کے ذریعہ تمہاری مدد کرے گا۔ سورۂ نوح میں حضرت نوحؑ کی زبانی اس واقعہ کو یوں نقل کیا گیا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا. يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا. وَ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا. (سورہ نوح)

استغفار اور توبہ کے بعد معصیت کی زندگی سے لوٹ کر اطاعت پر استقامت کے ساتھ جمے رہنا بھی ضروری ہے، صرف وقتی توبہ یا استغفار کافی نہیں، بارش کی کمی کے عذاب سے بچنے کے لئے دین پر استقامت بھی ضروری ہے، سورہ جن میں ارشاد خداوندی ہے:

وَ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَاءً غَدَقًا.

بارش کی کمی اور قحط کے موقع پر توجہ اور رجوع الی اللہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کا بھی اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ معمولی کپڑوں میں انتہائی عجز وانکساری کے ساتھ عیدگاہ تشریف لائے، خوب گریہ کیا، پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ (ترمذی شریف)

حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ نماز پڑھتے ہی بجلی کی کڑک اور چمک شروع ہوئی، پھر ایسی بارش ہوئی کہ آپؐ کے عیدگاہ سے مسجد نبویؐ پہنچنے تک نالے بہنے لگے اور صحابہ کرامؓ دوڑ کر محفوظ مقامات پر پناہ لینے لگے۔ آپ ﷺ کو بے ساختہ ہنسی آئی اور ارشاد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں۔ (ابوداؤد شریف)

استسقاء کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ استسقاء کوئی وقتی عمل نہیں ہے بلکہ یہ بندے کے خدا کی طرف رجوع ہونے کی علامت ہے، یہ وقت ہم سبھوں کے رجوع الی اللہ کا وقت ہے، ہمیں فضول خرچی، عیش و عشرت اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والے اعمال سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے۔

بارش کی کمی اور قحط سالی میں حکمرانوں کی ذمہ داری دوچند ہوجاتی ہے۔ قحط سے متاثرہ افراد کی مدد کے لئے حکومت کو پوری جدوجہد کرنی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب ایک مرتبہ مدینہ میں شدید قحط پڑا تو آپؓ بے حد متاثر ہوئے اور اطراف واکناف سے غلہ منگوا کر گھر گھر تقسیم کیا۔ خشک سالی سے متاثرہ افراد کی ہر طرح مدد کرنی چاہئے لیکن یہ وقتی تدابیر قحط سالی اور بارش کی کمی کا مستقل علاج نہیں ہے۔ گناہوں سے دوری، توبہ وانابت ہی آفاتِ سماوی سے بچنے کا پائیدار حل ہے۔

.....✦.....

آزادئ اظہارِ رائے اور خلفائے راشدین

✦ محمد مبشر نذیر

بعض افراد نے قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ وہ آیت یہ ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْأَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَ اِنْ تَسْأَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا. وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْم(المائدہ:۵:۱۰۰)

''اے ایمان والو! ان چیزوں کے بارے میں زیادہ سوال نہ کرو جو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں، لیکن اگر تم ایسے وقت میں یہ سوالات کرو گے تو وہ تم پر واضح کردی جائیں گی۔ اب تک جو تم نے کیا اللہ نے معاف کردیا اور وہ معاف کرنے والا اور بردبار ہے۔''

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دین اسلام میں غور وفکر ممنوع ہے، بالکل ہی غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے یہ بالکل ہی واضح ہے کہ اس آیت میں جن سوالات سے روکا گیا ہے وہ ایک مخصوص نوعیت کے سوالات ہیں۔

عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابيه ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: إن اعظم المسلمين جرما من سأل عن شیء لم يحرم فحرّم من اجل مسألته.

(بخاری، کتاب الاعتصام، حدیث ۷۲۸۹)

''سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑا مجرم وہ مسلمان ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھا جو حرام نہیں تھی، لیکن اس کے سوال کرنے کی وجہ سے وہ حرام کردی گئی۔''

و عن ابی ثعلبة الخشنی قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم ان اللّٰه فرض فرائض فلا تضيعوها و حرم حرمات فلا تنتهكوها وحد حدودا فلا تعتدوها و سكت عن اشياء من غير نسيان فلا تبحثوا عنها. (مشکوٰۃ: کتاب الاعتصام، حدیث ۱۹۷)

سیدنا ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے کچھ فرائض لازم کئے

ہیں، انہیں ضائع مت کرو۔ اس نے کچھ کام حرام قرار دیے ہیں، ان کے قریب بھی نہ جاؤ، اس نے کچھ حدود مقرر کی ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرو، لیکن اس نے کچھ چیزوں کے بارے میں قصداً خاموشی اختیار کی ہے، لہٰذا ان کے بارے میں تفتیش میں نہ پڑو۔

رسول اللہ ﷺ نے مثبت غور وفکر سے کبھی نہیں روکا۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت ایسے سوالات سے منع فرمایا گیا جن کے نتیجے میں کوئی کام حرام ہو جائے اور امت مشکل میں پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں خاموشی اختیار کی ہے، اس میں خاموش ہی رہنا چاہئے تاکہ لوگوں کے لئے انتخاب کی آزادی برقرار رہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس معاملے میں مسئول نہ ہوں۔

رہے مثبت سوالات تو ان کے بارے میں قطعی کوئی ممانعت نہ تھی۔ احادیث کے پورے ذخیرے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حلال وحرام کے مخصوص دائرے کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ سے بکثرت سوال کیا کرتے تھے اور آپؐ انہیں ہر طرح سے مطمئن کر دیا کرتے تھے۔

آزادئ اظہار سے متعلق خلفاء راشدین کا طرزِ عمل : رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین کا طرز عمل بھی یہی رہا۔ اس کی تفصیل کے لئے خلفاء راشدین کے طرز عمل کی کچھ مثالیں ہم بیان کر رہے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے پہلے خطبے میں اپنی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

قال عبید اللّٰہ أظنه عن أبیه قال لما ولی ابوبکر خطب الناس فحمد اللّٰہ و اثنی علیه ثم قال أما بعد أیها الناس قد ولیت أمرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن و سن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم السنن فعلمنا اعلموا ان اکیس الکیس التقوی و ان احمق الحمق الفجور و ان اقواکم عندی الضعیف حتی اٰخذ منه الحق و ان اضعفکم عندی القوی حدی اٰخذ له الحق ایها الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان أحسنت فاعینونی و ان زغت فقومونی.

(طبقات ابن سعد، ذکر ابوبکرؓ)

''جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: اے انسانو! مجھے آپ کے امور کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے اور میں اس کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ قرآن نازل ہوا اور نبی ﷺ نے سنت قائم فرمائی تو ہمیں دین کا علم ہوا۔ جان رکھئے کہ سب سے بہترین چالاکی اللہ سے ڈرنا ہے۔ سب سے بڑی بے وقوفی گناہ کرنا ہے۔ آپ میں سے جو شخص زیادہ طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک سب سے زیادہ کمزور ہے جب تک میں اس سے (اس کے ذمے عائد) حق وصول نہ

کرلوں، آپ میں سے جو شخص زیادہ کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا حق پہنچا نہ دوں۔ اے انسانو! میں تو (دین کی) پیروی کرنے والا ہوں نہ کہ کوئی بدعت پیدا کرنے والا۔ اگر میں اچھا کام کروں تو آپ میری مدد کیجئے اور اگر غلط راستہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے گا۔''

اس خطبے کی آخری بات محض عجز وانکسار ہی نہ تھی بلکہ صحابہ کا عمل یہی تھا۔ ارتداد کے خلاف جنگی کارروائی ہو یا لشکر اسامہ کی روانگی، روم وایران سے جنگ کا معاملہ ہو یا اپنے بعد آنے والے خلیفہ کی تقرری، ہر ہر معاملے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ کے مشورے سے ہی معاملات چلایا کرتے تھے اور تمام صحابہ کو کھلے عام اپنی رائے کے اظہار کی آزادی حاصل تھی۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مثال قائم فرمائی۔ لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جمعہ کے خطبے کے دوران کھڑے ہو کر بھرے مجمع میں آپ کا احتساب کر سکیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپ دو چادروں پر مشتمل لباس پہن کر جمعہ کے خطبے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ کے پاس دو چادریں کہاں سے آ گئیں جب کہ ہم سب کو تو مال غنیمت میں سے ایک ایک چادر ملی ہے۔ آپ نے خود جواب دینے کے بجائے اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اٹھ کر بتایا کہ میں نے اپنے حصے کی چادر ابا جان کو دیدی ہے۔ آپ نے اعتراض کرنے والوں کو گستاخ قرار نہیں دیا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے خواتین کے مہر کی رقم کی ایک حد مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ نماز جمعہ میں ایک خاتون نے اس سے سخت اختلاف کیا اور ان کی رائے کے مطابق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ بدل لیا۔ آپ نے ان خاتون کو بھی گستاخ قرار نہیں دیا۔

زمینوں کا انتظام کرنا ہو، جنگی تیاریوں کا معاملہ ہو، عوام کی فلاح و بہبود پر رقم خرچ کرنا ہو، مال غنیمت کی تقسیم ہو، ہر معاملے میں لوگوں کو اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔ جو شخص مجلس کی اکثریت کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اسی کی رائے پر حکومتی فیصلہ نافذ ہو جاتا۔ آپ دوسروں کو اپنا احتساب کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

عن سلمان ان عمر قال له أملك أنا ام خليفة فقال له سلمان ان أنت جبيت من ارض المسلمين درهما او اقل او اكثر ثم وضعته فی غير حقه فانت ملك غير خليفة فاستعبر عمر

(طبقات ابن سعد، ذکر عمر)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ

مسلمانوں کی زمین میں سے ایک درہم یا اس سے کم یا زیادہ وصول کریں اور اسے ناحق خرچ کریں تو آپ بادشاہ ہیں، خلیفہ نہیں ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے۔

عن سفيان بن ابى العوجاء قال قال عمر بن الخطاب و الله ما ادرى اخليفة انا ام ملك فان كنت ملكا فهذا امر عظيم قال قائل يا امير المؤمنين ان بينهما فرقا قال ما هو قال الخليفة لا ياخذ الا حقا و لا يضعه الا فى حق فانت بحمد الله كذلك و الملك يعسف الناس فيأخذ من هذا و يعطى هذا فسكت عمر. (طبقات ابن سعد، ذکر عمر)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ۔ اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔ کسی شخص نے کہا اے امیر المؤمنین! ان دونوں میں فرق ہے۔ خلیفہ وہ ہے جو سوائے حق کے (ٹیکس) وصول نہیں کرتا اور نہ ہی اسے ناحق خرچ کرتا ہے۔ الحمد للہ آپ ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ تو لوگوں پر ظلم کر کے ٹیکس لیتا ہے اور اسے اپنی مرضی سے خرچ کرتا ہے۔ عمرؓ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

خلیفہ بننے کے بعد طویل عرصے تک آپ نے تنخواہ نہیں لی بلکہ اپنے مال سے خرچ کرتے رہے۔ جب آپ کا اپنا مال ختم ہو گیا تو پھر صحابہ سے مشورہ کیا کہ میں اپنے گھر کے خرچ کا کیا کروں؟ سیدنا عثمان اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما کے مشورے کے مطابق آپ نے کھانے اور لباس کے لئے رقم بیت المال سے لینا شروع کی۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ اپنے دورِ خلافت میں عمرؓ روزانہ دو درہم تنخواہ لیتے تھے اور میری تنخواہ ایک سو اسی درہم ہوا کرتی تھی۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان ہی کے مقرر کردہ جج قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دعویٰ کر دیا۔ آپ نے اپنے حق میں دو گواہ سیدنا حسن و قنبر رضی اللہ عنہما کو پیش کیا۔ جج نے ان دونوں کی گواہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ ایک ان کا بیٹا تھا اور دوسرا آزاد کردہ غلام اور فیصلہ یہودی کے حق میں سنا دیا۔ یہودی نے یہ فیصلہ سن کر اسلام قبول کر لیا کہ انصاف کا یہ عالم ہے کہ قاضی ایک غیر مسلم کے حق میں خلیفہ وقت کے خلاف فیصلہ دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خلیفہ وقت کے معاملے میں آزادی رائے کا یہ عالم تھا تو پھر دیگر لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام نے آباء پرستی، شخصیت پرستی اور فکری غلامی کے دیگر تمام بتوں کو پاش پاش کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو نفسیاتی غلامی سے آزاد کر دیا۔ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تین چار سو سال کے بعد امت مسلمہ اسی نفسیاتی غلامی کا بڑے پیمانے پر شکار ہو گئی جس سے نکالنے کی کوشش اسلام نے کی تھی۔

بہ وقتِ اقامت

مقتدیوں کو کب کھڑا ہونا چاہئے؟

✦ مولانا مفتی نثار خالد قاسمی

استاذ حدیث جامعہ ہٰذا

اقامت کے وقت مقتدیوں کو کب کھڑا ہونا چاہئے؟ یہ ایک فقہی مسئلہ ہے، جس کی وضاحت سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ آج کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑی الجھن کا باعث بنا دیا ہے، جا بجا اس کے حوالے سے ناخوشگوار واقعات پیش آتے گئے ہیں، امتِ مسلمہ اس مسئلہ کے تعلق سے دو حصوں میں بانٹ دی گئی ہے اور دونوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج اور فاصلہ واقع ہو گیا ہے کہ اس کا پاٹنا کارے دارد بن گیا ہے، جب کہ یہ مسئلہ فقہی کتابوں میں جہاں کہیں بھی آیا ہے تقریباً اپنی تمام صورتوں کے ساتھ مذکور ہے، نیز اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ مقتدیوں کا اس طرح کھڑا ہونا آدابِ نماز میں سے ہے جیسا کہ درمختار میں ہے **ولھا آداب ترکہ لا یوجب اساءۃ ولا عتاباً کترك سنة الزوائد لكن فعله افضل** (ص۱۵۴، ج۲، آداب الصلوۃ، دار الکتاب)

جب اس کا کرنا بہتر اور نہ کرنا بدون کراہت و اساءت کے درست ہے یعنی نہ کرنے والا کسی بھی طرح عتاب کا سزاوار نہیں ہے تو پھر اس کو کسی بحث و گفتگو کا موضوع بنانا ہی نہیں چاہئے مگر کیا کیا جائے اس اس کا کہ کچھ لوگوں کے ماتھے پر ہٹ اور ضد کا بھوت اس طرح سوار ہو جاتا ہے کہ جو اس کی نہ مانے وہ اس کے سر چڑھ جانے کو تیار ہو جاتا ہے، آستین چڑھا لیتا ہے۔ اللہ حفاظت فرمائیں۔

ضد اور ہٹ کی انتہاء : چنانچہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مکبر جب اقامت کہتا ہوا حی علی الفلاح پر پہنچے تو اسی وقت سبھوں کو کھڑا ہونا ہے، اس سے قبل یعنی شروع اقامت کے وقت کھڑا ہونا غلط اور مکروہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ائمہ مساجد کو دیکھا گیا کہ مقتدی نے اقامت شروع کی تو یہ مسجد میں جہاں تشریف فرما ہوتے ہیں وہاں سے اٹھ کر پیش مصلی پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر جب مکبر حی علی الفلاح پر پہنچتا ہے اس وقت امام صاحب کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کرنا ضروری ہے، یہی طریقۂ نبوی ہے اور اسی کا حکم ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کرنا سخت گناہ ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو سمجھ لیا جائے۔ بہ حیثیت ایک مسلمان ہونے کے اولاً ہم پر یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے محسن و پیشوا حضرت امام الانبیاء ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کریں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس تعلق سے آپ علیہ السلام کا اپنا عمل کیا تھا؟ آپؐ نے اپنی پاکیزہ زندگی میں اس مسئلہ پر کس طرح عمل کیا اور کرایا ہے؟

تو آئیے یہ امام مسلمؒ کی صحیح مسلم ہے جس کے جلد اول میں ایک باب ہے "**باب متی یقوم الناس فی الصلوٰۃ**" اس میں امام مسلم علیہ الرحمہ نے تین جلیل القدر صحابہ کرام حضرت ابوقتادہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابر بن سمرہؓ کی چار روایتیں ذکر ہیں۔

حدیث (۱) : حضرت ابوقتادہؓ کی روایت کا متن یہ ہے: **عن ابی قتادہ قال قال رسول اللہ** ﷺ **اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی.** (ص۲۲۰، ج۱)

ترجمہ : جب نماز کی اقامت کہی جائے تو تم لوگ جب تک مجھے دیکھ نہ لو کھڑے مت ہونا۔

مطلب حدیث پاک کا یہ ہے کہ بعض دفعہ رسول اللہ ﷺ کے موذنِ خاص حضرت بلالؓ نبی کریم ﷺ کے حجرۂ شریفہ سے نکلنے کے قبل ہی اقامت شروع کر دیتے اور حسب دستور صحابہ کرامؓ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے، پھر بسا اوقات آپ علیہ السلام کو حجرۂ شریفہ سے نکلنے میں دیر ہو جاتی اور حضراتِ صحابہ کرامؓ کھڑے کھڑے آپ کی آمد کا انتظار کرتے۔ آپؐ نے ایسے مواقع کے لئے یہ ہدایت ارشاد فرمائی کہ میرے نکلنے اور مجھے دیکھنے سے قبل کھڑے ہوا نہ کرو۔

آپؐ کی اس ہدایت کا مقصد واضح ہے کہ آپ حضرات صحابہؓ کو کھڑے ہونے کی مشقت سے بچانا چاہ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ آچکے ہیں اور اقامت ہو رہی ہے تو پھر کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ زرقانی نے کہا ہے کہ: **انہ نھی عن القیام قبل خروجہ و تسویغ لہ عند رؤیتہ وھو مطلق غیر مقید بشیء من الفاظ الاقامۃ.** (زرقانی شرح موطا امام مالکؒ ج۱۳۳، ج۱، منقول از رضا خانیت کے علامتی مسائل، ص۵۶)

ترجمہ اس عبارت کا یہ ہے بلاشبہ حضور ﷺ نے اپنے حجرۂ شریفہ سے باہر آنے سے قبل کھڑے ہونے کو منع فرمایا اور دیکھتے ہی کھڑے ہونے کو جائز قرار دیا اور یہ کھڑا ہونا اقامت کے کسی الفاظ کے ساتھ مقید نہیں ہے یعنی دیکھتے ہی کھڑا ہو جانا مطلقاً جائز ہے خواہ اقامت شروع ہوتے ہی آدمی کھڑا ہو یا شروع ہونے کے بعد کسی خاص کلمہ پر پہنچنے پر کھڑا ہو دونوں ہی صورتیں جائز و درست ہیں۔

معلوم ہوا کہ امام کے باہر آنے سے قبل تو کھڑا ہونا منع اور مکروہ ہے اور اس کی وجہ بقول علامہ نوویؒ یہ ہے: **لئلا یطول علیہ القیام ولانہ قد یعرض لہ عارض فیتاخر بسببہ.** (الکامل علی ھامش الصحیح لمسلم ص۲۲۱، ج۱۔ و کذا فی عمدۃ القاری ص۶۷۶، ج۱۔ بحوالۂ رضا خانیات کے علامتی مسائل، ص۱۳)

یعنی مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب جب اپنے حجرہ سے نہیں نکلے تو ممکن ہے کہ مقتدیوں کو دیر تک کھڑا رہنا پڑے کیوں کہ ایسا ہو ہی سکتا ہے کہ ادھر اقامت ہوئی اور حال یہ ہے کہ امام اپنے حجرہ میں ہے اور ان کو کوئی ضرورت پیش آ گئی جس کی وجہ سے ان کو حجرہ سے نکلنے میں تاخیر ہو جائے۔

تو امام کے حجرہ سے باہر نکلنے سے قبل دراں حالیکہ اقامت شروع ہو چکی ہو مقتدیوں کا بوجہ مذکور کھڑا ہونا مکروہ ہے مگر امام صاحب باہر ہیں تو پھر کھڑا ہونا منع نہیں ہے، نہ مقتدیوں کا کھڑا ہونا منع ہے اور نہ ہی امام کا۔ چنانچہ فتح الباری جلد دوم، ص ۹۵ پر علامہ عسقلانی نے مسند عبدالرزاق کے حوالہ سے یہ مرسل روایت نقل کی ہے: **عن ابن جریج عن ابن شهاب ان الناس كانوا ساعة يقول المؤذن الله اكبر يقومون الى الصلوٰة فلا يأتى النبىؐ مقامه حتى تعتدل الصفوف.** (بحوالہ رضاخانیت کے علامتی مسائل)

اس روایت میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ مکبر کے اللہ اکبر (جو اقامت کا شروع والا کلمہ ہے) کہتے ہی صحابہ کرامؓ کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ علیہ السلام اس وقت اپنی جگہ تشریف لاتے جب تمام صفیں سیدھی ہو جاتیں۔

حدیث (۳،۲) : دوسرے صحابی مشہور ترین بزرگ صحابہ محدثین میں بلند رتبہ کے مالک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت امام مسلمؒ نے ان کی دو روایتیں ذکر کی ہیں:

(الف) پہلی روایت کا متن یہ ہے: **اخبرنى ابو سلمة بن عبدالرحمن بن عوف انه سمع ابا هريرةؓ يقول اقيمت الصلوٰة فقمنا فعد لنا الصفوف قبل ان يخرج الينا رسول الله ﷺ الخ.**

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اقامت کہی جاتی تو ہم سب کھڑے ہو کر صفیں سیدھی کرتے قبل ازیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لاتے۔

(ب) عن ابى هريرة ان الصلوة كانت تقام لرسول الله ﷺ فياخذ الناس مصافهم قبل ان يقوم النبى ﷺ مقامه.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کی امامت کے لئے اقامتِ نماز کہی جاتی تھی اور آپ ﷺ کے اپنی جگہ کھڑے ہونے سے قبل صحابہ کرامؓ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی دونوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عادت یہ تھی کہ جب موذن اقامت شروع کر دیتے تو ہم سب لوگ کھڑے ہو جاتے اور صفیں درست کر لیتے۔

حدیث (۴) : تیسرے صحابی حضرت جابر بن سمرہؓ ہیں جو حضرت سعد بن وقاصؓ کے بھانجے ہیں۔

حضرت جابرؓ بن سمرۃ کی روایت کا متن یہ ہے: **كان بلال يؤذن اذا دحضت فلا يقيم حتى يخرج النبى ﷺ فاذا خرج اقام الصلوٰة حين يراه.**

ترجمہ : حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ سورج ڈھلنے کے بعد اذان کہتے تھے اور جب تک رسول اللہؐ باہر تشریف نہیں لاتے اقامت نہیں کہتے، چنانچہ جب آپ باہر تشریف لاتے تو اقامت شروع کر دیتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ کی عادت تھی کہ حجرۂ شریفہ کی طرف نظر رکھتے تھے اور جوں ہی رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے کہ آپؐ باہر تشریف لائے تو اقامت شروع کر دیتے۔ زرقانی نے حدیث شریف کا یہی مفہوم لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: **ان بلالاً کان یراقب خروج النبیؐ فاول ما یراہ یشرع فی الاقامۃ قبل ان یراہ غالب الناس ثم اذا رأوا، قاموا فلا یقوم مقامہ حتی تعدل صفوفھم.** (زرقانی علی الموطا، ص۱۳۳، ج۱، بحوالہ رضا خانیت کے علامتی مسائل، ص۵۲)

الفاظ کی قدرے تبدیلی کے ساتھ یہی بات علامہ نوویؒ نے بھی لکھی ہے۔ دیکھئے (الاکمال علی ہامش الصحیح لمسلم، ص۲۱۱، ج۱)

یہ چند احادیث مسلم شریف کی ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کا عمل بوقت اقامت کھڑے ہونے میں کیا رہا ہے وہ معلوم ہو گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ: (۱) شروع زمانہ میں تو حضرت بلالؓ اقامت اس وقت کہہ دیتے تھے کہ آپؐ ابھی اپنے حجرۂ مبارکہ میں ہوتے اور حضرت بلالؓ کے اقامت کہتے ہی حضرات صحابہ کرامؓ کھڑے ہو جاتے اور صفیں درست کر لیتے مگر (۲) بعد میں یہ طریقہ ختم کر دیا گیا اور حکم یہ ملا کہ جب مجھے آتا ہوا دیکھ لو پھر اقامت کہو۔ چنانچہ اس پر عمل شروع ہوا اور حضرت بلالؓ اقامت اس وقت کہنے لگے جب آپؐ امامت کے لئے حجرۂ مبارکہ سے نکل جاتے اور حضرت بلال آپؐ کو دیکھ لیتے اور حضرت بلالؓ کے اقامت شروع کرتے ہی صحابہ کرامؓ بھی کھڑے ہو جاتے اور قبل ازیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی امامت کی جگہ جلوہ افروز ہوتے صفیں درست ہو جاتیں۔ تیسری بات یہ بھی معلوم ہو گئی کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا کھڑا ہو جانا حضرت بلالؓ کی اقامت کے کسی لفظ کے ساتھ خاص نہ تھا، کہ جب وہ اس لفظ پر پہنچتے تب ہی حضرات صحابہؓ کھڑے ہوتے بلکہ فتح الباری کے حوالے سے جو روایت ذکر کی گئی ہے اس سے تو یہ بہ وضاحت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلالؓ کے ''اللہ اکبر'' کہتے ہی صحابہ کرامؓ کا کھڑا ہونا شروع ہو جایا کرتا تھا اور آپ علیہ السلام کے محراب تک آتے آتے صفیں مکمل درست ہو جاتی تھیں۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہو گیا کہ شروع اقامت ہی سے مقتدیوں اور امام کا کھڑا ہونا منع نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ضرور بالضرور شروعِ اقامت کے وقت کھڑے ہونے سے منع فرماتے جس طرح آپ نے اس وقت کھڑے ہونے سے منع کیا ہے جب آپؐ حجرہ میں ہیں اور ادھر اقامت کہی جا چکی ہے بلکہ بنظر غائر حدیث کی کتابوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابتداء اقامت ہی سے کھڑا ہونا ثابت ہے۔

یہ گفتگو تو احادیث کی روشنی میں تھی۔ اب ذرا فقہاء کرام کی عبارتیں دیکھ لی جائیں۔ فقہ کی مشہور کتاب درمختار ص۷۳، ج۱، باب صفۃ الصلوۃ میں **ولھا آداب** کے تحت ہے **والقیام لامام و مؤتم حین قیل حی علی**

الفلاح خلافاً لزفر فعنده عند حی علی الصلوۃ ابن کمال ان کان الامام بقرب المحراب والا فیقوم کل صف ینتھی الیه الامام علی الاظھر و ان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرھم علیه الا إذا اقام الامام بنفسه فی مسجد فلا یقفوا حتی یتم اقامته ظھیریة و ان خارجه قام کل صف ینتھی الیه بحر. الخ.

(ولھا آداب ترکه لا یجب اساء ۃ ولا عتاباً کترك سنة الزوائد لکن فعله افضل)

ترجمہ ومطلب : نماز کے کچھ آداب بھی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ مقتدی اور امام اس وقت کھڑے ہوجائیں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے۔اس میں امام زفر کا اختلاف ہے۔ان کے نزدیک حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا نماز کا ادب ہے۔یہ اس وقت ہے جب کہ امام محراب کے قریب ہو ورنہ پھر جس صف سے ہو کر امام آگے جائے اس صف کے لوگ کھڑے ہوجائیں گے اور اگر امام آگے سے مسجد میں داخل ہوں تو جوں ہی لوگوں کی نگاہ ان پر پڑے لوگ کھڑے ہوجائیں گے اور اگر امام خود ہی اقامت کہہ رہے ہوں تو پھر ان کی اقامت پوری ہونے پر لوگ کھڑے ہوں گے۔بشرطیکہ وہ مسجد کے اندر ہوں ورنہ اگر وہ مسجد کے باہر ہوں اور وہیں سے اقامت کہہ رہے ہوں تو جب تک مسجد میں داخل نہ ہوجائیں لوگ کھڑے نہیں ہوں گے اور جب آجائیں تو جس صف سے ہو کر امام آگے کی طرف آئے اس صف کے لوگ کھڑے ہوجائیں۔

مذکورہ بالا عبارت درمختار کی ہے جس میں بوقت اقامت مقتدی اور امام کو کب کھڑا ہونا چاہئے کو فقہ حنفی کی رو سے پیش کیا گیا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ مسئلہ مذکور کے حوالہ سے امام کی تین حالت ہوسکتی ہے۔پہلی حالت یہ ہے کہ وہ بوقت اقامت مسجد میں محراب کے قریب کہیں موجود ہو تو پھر ایسی حالت میں نماز کا ادب یہ ہے کہ جب مکبر حی علی الفلاح پر تکبیر کہتا ہوا پہنچے تو تمام لوگوں کو (امام ہوں یا مقتدی) کھڑے ہوجانا چاہئے اور ان کی دوسری حالت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ مقتدیوں کے سامنے سے جیسے دیوار قبلہ میں کوئی دروازہ ہو اور امام اس دروازے سے مسجد میں داخل ہو تو لوگوں کی نگاہ جوں ہی ان پر پڑے لوگ کھڑے ہوجائیں اور اگر ایسا ہو کہ وہ مسجد کے الٹے رخ سے مسجد میں آئے اور اپنی جگہ (محراب) جائے تو پھر جس صف سے ہو کر امام جانب محراب جائے اس صف کے لوگ کھڑے ہوجائیں گے، یہ ان کی تیسری حالت ہے۔ایک چوتھی حالت یہ بھی ہے کہ وہ خود اقامت کہے تو اندریں صورت اقامت مکمل ہونے پر لوگ کھڑے ہوں گے۔

فقہ حنفی کی تمام متداول کتابیں جیسے النہر الفائق ،ص۲۰۳، ج۱، اور البحر الرائق ،ص۵۳۱، ج۱، اور عالمگیری ص۵۷، ج۱ (الفصل الثانی من الباب الثانی فی الاذان والاقامۃ) اور بدائع ص۲۹ ج۲ اور حاشیۃ الطحطاوی ص۲۷۸، اور غنیۃ المستملی وغیرہ میں الفاظ کے قدرے فرق کے ساتھ مسئلہ مذکورہ کو اسی طرح ذکر کیا ہے۔

چند اہم باتیں : اب یہاں چند باتیں جاننی ضروری ہیں اس لئے کہ کچھ لوگ اپنے فن کے بڑے چالاک ہوتے ہیں اور اپنے مطلب کی عوام کو باور کرانے کے لئے اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کرنے میں دریغ نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چاری عوام گمراہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ جو مسئلہ ذکر کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس وقت کھڑا ہونا چاہئے یہ نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے اور ادب کا معنی یہ ہے کہ اس کا کرنا تو بہتر ہے اور نہ کرنا تو یہ کوئی برا بھی نہیں ہے یعنی اس کو مکروہ تنزیہی کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی موجب عتاب و سرزنش۔ چنانچہ علامہ حصکفی نے آداب کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: **ترکه لا یوجب اساءة ولا عتاباً کترك سنة الزوائد لکن فعله افضل** کہ اس کا ترک نہ موجب اساءۃ ہے اور نہ موجب عتاب۔

بقول علامہ شامی ''اساءۃ'' ایک درجہ ہے جو مکروہِ تحریمی و مکروہِ تنزیہی کے درمیان درمیان ہوتا ہے۔ علامہ کی عبارت یہ ہے: (**انها دون کراهة التحریم وافحش من کراهة التنزیه**). (شامی ص۲۶۵، ج۲، دارالکتاب)

دوسری بات یہ ہے کہ ایک خاص صورت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ مسجد میں موجود لوگوں کو مکبر کے حی علی الفلاح کہنے کے وقت تک کھڑے ہو جانا چاہئے اس کی حکمت کیا ہے؟ علامہ کاسانیؒ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ان قوله ''حی علی الفلاح'' دعاء الی ما به فلاحهم و امر بالمسارعة الیه فلا بد من الاجابة الی ذالك ولن تحصل الاجابة الا بالفعل وهو القیام الیها**. (بدائع ص۲۹، ج۲، فیصل)

کہ مکبر نے حی علی الفلاح کہہ کر لوگوں کو اس چیز کی طرف دعوت دی ہے جس میں ان کے لئے فلاح و کامیابی ہے اور اس کے لئے اس نے ''حی'' کا صیغۂ امر استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی فلاح کے خاطر اس کام کو اب جلد از جلد کرنا چاہئے اور ظاہر ہے کہ یہ بات بغیر کھڑے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب تو کھڑا ہو ہی جانا چاہئے۔ البتہ اگر امام مسجد میں نہ ہو تو پھر جب تک وہ آ نہ جائے لوگوں کو کھڑا نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ لوگوں کا کھڑا ہونا نماز ہی کے لئے ہوگا اور امام موجود نہ ہونے کی صورت میں نماز کی ادائیگی ناممکن ہے تو کھڑا ہونا اس صورت میں کچھ سود مند نہ ہوگا بلکہ امام کے انتظار میں بجز حیران و پریشان ہونے کے کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ علامہ موصوف فرماتے ہیں: **لان القیام لاجل الصلوٰة ولا یمکن اداء ها بدون الامام فلم یکن القیام مفیداً** . ص۳۱، ج۲۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ ایک دفعہ مسجد میں تشریف فرما ہوئے تو لوگوں کو کھڑے ہوئے اپنا انتظار کرتے ہوئے پایا تو آپ نے فرمایا: **مالی اراکم سامدین** (مصنف ابن ابی شیبۃ بحوالہ بدائع، ص۳۱) کہ میں آپ لوگوں کو کھڑے کھڑے انتظار کرتے ہوئے کیوں دیکھ رہا ہوں۔

معلوم ہوا کہ اگر امام امامت کی پوزیشن میں نہ ہو تو پھر لوگوں کو کھڑے نہیں ہونا چاہئے تا آں کہ وہ امامت کی

پوزیشن میں آجائیں جس کی صورت بقول علامہ موصوف یہ ہے: **ثم ان دخل الامام من قدام الصفوف فکما رأوہ قاموا لانہ کلما دخل المسجد قام مقام الامامۃ و ان دخل من وراء الصفوف فالصحیح انہ کلما جاوز صفا قام ذالك الصف لانه صار بحال لو اقتدوا به جاز فصار فی حقهم کانه اخذ مکانه.**

ترجمہ : اب امام اگر صفوں کے آگے سے مسجد میں آتا ہے تو اس کو دیکھتے ہی لوگ کھڑے ہوجائیں کیوں کہ اس صورت میں داخل ہوتے ہی گویا وہ امامت کی جگہ پر آ گیا اور اگر امام صفوں کے پیچھے کی طرف سے داخل ہو تو جس صف سے گذرے وہ کھڑی ہوجائے اس لئے کہ اس صف کے حق میں امام اس پوزیشن میں ہے کہ اگر اس کی اقتداء کرلیں تو جائز ہوگی پس گویا ان کے لئے امام اپنی جگہ پر آ گیا۔

تیسری بات کہ فقہی کتابوں میں جہاں بھی مذکورہ مسئلہ کا ذکر آیا ہے وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ امام کے مسجد کے قریب بہ محراب موجود ہونے کی صورت میں تکبیر کہی جارہی ہو اور لوگ اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہوجائیں تو یہ منع ہے، مکروہ ہے اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ آدمی پہلے ہی سے نماز کے لئے مستعد و تیار ہو جو شریعت میں مطلوب ہے۔ چنانچہ بحوالہ زرقانی یہ مذکور ہو چکا ہے کہ امام کے دیکھتے ہی لوگ کھڑے ہوجائیں یہ جائز ہے اور یہ اقامت کے کسی خاص لفظ کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اسی طرح بحوالۂ فتح الباری آچکا ہے کہ حضرات صحابہ کرام موذن کے اقامت شروع کرتے ہی کھڑے ہوجاتے تھے اور رسول کریمؐ کے اپنی جائے امامت پر آتے آتے صفیں سیدھی ہوجاتی تھیں اور یہ کھڑے ہونا بھی استحباب کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی مستحب ہی ہے۔ ایک واضح دلیل تو یہی ہے یعنی صحابہ کرامؓ کا اولِ اقامت پر کھڑا ہوجانا نیز مذکورہ بالا فقہی عبارت میں امام کے قریب بہ محراب موجود ہونے کی صورت میں لوگوں کے حی علی الفلاح پر موذن و مکبر کے پہنچتے وقت کھڑے ہونے کو جو مستحب کہا گیا ہے یہ اس استحباب کی آخری حد ہے یعنی اگر کوئی صاحب ذکر وغیرہ میں مشغول ہو تو اسے موذن کے اس کلمہ پر پہنچتے وقت کھڑا ہوجانا چاہئے یہ ہرگز مطلب نہیں ہے اس کا کہ اس سے قبل کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ چنانچہ علامہ طحطاوی نے درمختار کی مذکورہ بالا عبارت کے تحت تحریر فرمایا ہے **والظاهر انه احتراز عن التاخير لا التقديم حتى لو قام اول الاقامة لا بأس به.** (طحطاوی علی الدرر، ص ۳۳۱، ج ۱)

چوتھی بات! موذن کے حی علی الفلاح تک دورانِ اقامت پہنچتے ہی لوگوں کو کھڑا ہوجانا چاہئے بصورتیکہ امام قریب بہ محراب موجود ہو۔ یہ نماز کا ادب ہے اور صفوں کا تسویہ (سیدھی ہونا) اس سے کہیں زیادہ اہم امر ہے۔ حدیث میں اس کو ''حسنِ صلوٰۃ'' کہا گیا ہے۔ دیکھئے مسلم شریف ص ۱۸۲، ج ۱ **اقیموا الصف فی الصلوٰۃ فان اقامة الصف من حسن الصلوة** اور حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے **فان تسوية الصف من تمام**

الصلوۃ اورامام بخاریؒ نے اسی عنوان کا ایک باب ہی بخاری شریف جلداول میں قائم فرمایا''**باب اقامۃ الصف من تمام الصلوٰۃ**'' ص۱۰۰، ج۱۔علامہ عینی نے فرمایا ہے کہ تسویۃ الصفوف نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔(بخاری شریف،ص۱۰۰کا حاشیہ،ص۵)

اس کے ساتھ اس بات کو بھی ملالیا جائے کہ امام کو تکبیر کب کہنی چاہئے؟ درمختار کی مذکورہ بالاعبارت کے بعد ہی یہ عبارت ہے:**و شروع المام (فی الصلوٰۃ) مذ قیل قدقامت الصلوٰۃ الخ** اور عالمگیری ص ۵۷ میں ہے **و یکبر الامام قبیل قولہ قدقامت الصلوٰۃ الخ**. وکذافی البدائع ص۱۲۹، ج۲ یعنی مکبر کے دورانِ اقامت قد قامت الصلوٰۃ پر پہنچتے ہی امام کو تکبیر تحریمہ کہہ دینی چاہئے، یہ بھی نماز کے آداب میں سے ہے۔اور مقتدیوں کو بھی بقول حضرت امام ابوحنیفہؒ امام کی تکبیر کے ساتھ ساتھ تکبیر تحریمہ کہنی چاہئے جیسا کہ بدائع میں ہے **و منھا ان یکبر المقتدی مقارناً لتکبیر الامام فھو افضل باتفاق الروایات عن ابی حنیفۃ الخ** . ص۲۸، ج۲

مذکورہ بالا ان چند باتوں کو سامنے رکھیں پھر حی علی الفلاح پر کھڑا ہونے والوں کا اصرار اور اس سے قبل کھڑے ہونے والوں کو ترچھی نگاہ سے دیکھنے والوں کی بے جا جرأت دیکھیں اور ان ہی سے پوچھیں کہ جب ہر کس و ناکس حی علی الفلاح پر کھڑا ہوگا اور یہی مستحب ہے اور اس سے قبل کھڑا ہونا استحباب کے خلاف ہے تو پھر صفوں کا تسویہ والی سنت پر عمل کب ہوگا؟ اور اگر بقول ان کے وقت موصوف پر کھڑے ہو کر تسویہ والی سنت کا خیال کیا جائے تو پھر قد قامت الصلوٰۃ سے قبل امام اور مقتدیوں کو تکبیر تحریمہ کہہ لینا چاہئے اس پر کس طرح عمل ہوگا؟

اور یہ بات واضح رہے کہ صفوں کا سیدھا کرانا بھی امام کی ذمہ داری ہے جیسا کہ صحاح کی احادیث اس پر دلالت کرتی ہے اور فقہی عبارتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔درمختار میں ہے **و یصف (ای یصفھم الامام بأن یامرھم بذالك** (ص۲۶۵، ج۲، مطلب ھل الاساءۃ دون الکراھۃ)

ظاہر ہے کہ اس عقدہ کا ان بے چاروں کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ہاں اگر یہ لوگ اس بے جا اصرار کو ترک کر دیں اور احادیث و فقہی عبارتوں سے جو واضح ہوتا ہے اُسے مان لیں تو پھر صفیں بھی سیدھی ہو جاویں اور امام و مقتدیوں کی تکبیر تحریمہ اپنے وقت ہی پر ہو جائے۔

ایک دھوکہ اور اس کا ازالہ : اب اخیر میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ اس موقع پر فقہی کتابوں کی ایک عبارت سے دھوکا ہو گیا ہے۔وہ عبارت یہ ہے:**اذا دخل الرجل عند الاقامۃ یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قولہ حی علی الفلاح کذا فی المضمرات** (عالمگیری،ص۵۷، ج۱) **فصل ثانی من الباب الثانی فی الاذان**. اسی طرح حاشیہ الطحطاوی علی المراقی (ص۲۷۸، فیصل دیوبند) کی یہ عبارت ہے:**و اذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ و دخل رجل المسجد فانہ**

یقعد ولا ینتظر قائما فانه مکروه کذا فی المضمرات قهستانی و یفهم منه کراهة القیام ابتداء الاقامة والناس عنه غافلون و کذا فی عمدة الرعایة علی هامش شرح الوقایة ص۱۳۶، ج۱، باب الاذان۔

عمدۃ الرعایہ، عالمگیری اور حاشیۃ الطحطاوی دونوں کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مقتدیوں کا کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے مگر انتظار کرنا کس کا؟ اسی میں دھوکا ہوا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موذن کے حی علی الفلاح کہنے کا کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی ہو اس کا انتظار کھڑے ہوکر نہ کرے بلکہ بیٹھ جائے پھر جب موذن کلمۂ مذکور کہہ ڈالے تو کھڑے ہو اور علامہ طحطاوی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ابتداء اقامت میں پھر تو کھڑا ہونا ہی مکروہ ہے اور لوگ اس سے غافل ہیں۔

یہ تو ابھی سامنے آئے گا کہ غفلت کن سے ہوئی ہے مگر سرِ دست یہ جان لینا چاہئے کہ مضمرات کی عبارت میں جس انتظار کو مکروہ کہا گیا ہے وہ لوگوں کو امام کا انتظار کرنا ہے جس کی مختصر سی وضاحت یہ ہے کہ لوگ مسجد میں آئے اور دیکھ رہے ہیں کہ کسی وجہ سے مثلاً وقت نہیں ہوا ہے یا خود امام مسجد میں اب تک نہیں آیا ہے یا وہ امامت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کیوں کہ وہ کسی ضروری کام میں مشغول ہے تو پھر لوگوں کو چاہئے کہ مذکورہ بالا ان جیسی صورتوں میں کھڑے نہ رہیں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ بخاری شریف ص۸۹، ج۱ میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ نماز کی اقامت کہی جا چکی ہے اور رسول اللہ ﷺ مسجد کے ایک گوشہ میں ایک شخص سے گفتگو فرما رہے ہیں جس میں دیر بھی ہوئی اتنی کہ آپ جب اپنی جگہ پہنچے تو کچھ لوگ اونگھ رہے تھے۔ **عن انسؓ قال اقیمت الصلوة والنبی یناجی رجلاً فی جانب المسجد فما قام الی الصلوة حتی نام القوم (باب الامام تعرض له الحاجة بعد الاقامة)** نیز یہ روایت بخاری جلد ثانی ص۹۳۱ میں بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں لوگوں کا کھڑے ہوجانا کچھ سود مند نہیں ہے کیوں کہ جماعت کی نماز بغیر امام کے ہوتی ہی نہیں، لہٰذا ایسی صورت میں لوگوں کو بیٹھ ہی جانا چاہئے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لوگوں کے کھڑے ہونے کے لئے امام کا امامت کی پوزیشن میں ہونا ہی اصل ہے۔ چنانچہ وہ جب سامنے سے امامت کی جگہ پر آتا ہے یا مقتدیوں کے پیچھے سے امامت کی جگہ کی طرف بڑھتا ہے تو جن جن لوگوں کے حق میں وہ امامت کی پوزیشن میں ہوتا ہے انہیں کھڑے ہوجانے کا حکم ہے، کما مر۔ کلمہ حی علی الفلاح کے کہنے پر لوگوں کا کھڑا ہونا کچھ موقوف نہیں ہے جیسا کہ حدیث مذکور میں لوگ اقامت ہونے پر کھڑے ہوگئے ہیں مگر بے سود ہوا ان کا کھڑا ہونا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول مسجد میں داخل ہوتے وقت اقامت کہی جانے کی حالت

میں اس کے شروع میں بیٹھنا نہیں تھا بلکہ منصب امامت کے حوالہ سے ایک بڑا کام تسویہ صفوف تھا جیسا کہ صحاح کی روایت میں آتا ہے کہ آپ صحابہ کرامؓ کے کاندھوں کو پکڑ کر فرماتے تھے کہ سیدھے کھڑے ہو جائیں۔

اور فرماتے تھے کہ آگے پیچھے نہ ہوں ورنہ دلوں میں اختلاف ہوگا۔ دیکھئے مسلم شریف، ص۱۸۱، ج۱، باب تسویۃ الصفوف اسی کو کہا گیا ہے کہ ''صفیں کج، دل پریشان''

جب ایسا ہے تو پھر آج کل بعض حضرات کا اپنی جائے امامت پر جا کر بیٹھ جانا اور تسویہ صفوف جیسے اہم کام سے اپنے کو سبکدوش کر لینا یا جاننا کیا یہ سنت کا اتباع ہے؟ یا فقط اپنی انا اور ضد ہے۔ حفظنا اللہ۔

عالمگیری وحاشیۃ الطحطاوی وغیرہ کی مذکورہ بالا عبارت کے تعلق سے یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ یہ دراصل اس عبارت کے تعلق سے ایک تعبیر ہے اور اس صورت میں فتاویٰ عالمگیری کے جامعین اور علامہ طحطاوی اور علامہ لکھنویؒ کی شان میں نہ تو کوئی حرف آتا ہے اور نہ ہی نصوصِ شریعت کی خلاف ورزی لازم آتی ہے ورنہ تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اس عبارت میں کچھ خامی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دونوں عبارتیں مضمرات سے ماخوذ ہیں اور مضمرات کی عبارت کیا ہے؟ علامہ قہستانی نے جامع الرموز میں وہ عبارت بحوالہ منیۃ ان الفاظ میں نقل کی ہے: **و ذکر فی المنیة انه اذا قام والامام لم یصل رکعتی الفجر لا یجب الاعادة بعد ادائه و فی الکلام ایماء خفی الی انه لو دخل احد عند الاقامة یقعد لکراهة القیام والانتظار کما فی المضمرات** (جامع الرموز، ص۵۸، ج۱)

مضمرات کی اصل عبارت یہ ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فجر کا وقت ہے اقامت کہی جا چکی ہے، امام نے فجر کی دوگانہ سنت نہیں پڑھی تھی، لہٰذا وہ سنت پڑھنے میں مشغول ہو گیا، اب سنت سے فارغ ہو کر جماعتِ فرض ہوگی تو پھر اقامت کا اعادہ ضروری نہیں ہوگا۔ صاحب کتاب فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں ہلکا سا اشارہ اس بات کا ملتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا صورت میں کوئی شخص اقامت کے وقت داخل ہوا ہو تو اس کو بیٹھ جانا چاہئے کیوں کہ کھڑے کھڑے انتظار کرنا مکروہ ہے۔

مضمرات کی مذکورہ بالا عبارت میں کہیں بھی حی علی الفلاح کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ عالمگیری اور طحطاوی علی المراقی اور عمدۃ الرعایہ میں کہاں سے اس لفظ کو اصل مسئلہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ آنے والا شخص اس وقت تک بیٹھے جب تک کہ موذن حی علی الفلاح نہ کہے، نیز جب **لا یجب الاعادة بعد ادائه** ہے یعنی یہ کہ دوبارہ اقامت بھی نہیں کہنی ہے تو پھر حی علی الفلاح کہنے کا ذکر ہی کیا؟ اور **یفهم منه کراهة القیام ابتداء الاقامة والناس عنه غافلون** سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتداء اقامت میں کھڑے ہونے کا مکروہ ہونا فقہاء متقدمین سے منقول نہیں ہے بلکہ یہ صاحب کتاب علامہ طحطاوی کی اپنی فہم ہے اور وہ اسی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے جو سمجھا ہے مضمرات کی عبارت سے لوگ اس سے غافل ہیں۔

"والناس عنه غافلون" غفلت کن سے ہورہی ہے؟ اوپر کی سطروں سے واضح ہوگیا کہ غفلت مسئلہ مذکور کے حوالہ سے لوگوں میں نہیں ہے بلکہ عبارتِ مضمرات کے نقل کنندہ حضرات میں ہے۔ واللہ اعلم

نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ علامہ طحطاوی سے قبل لوگوں کا عمل ابتداء اقامت ہی سے کھڑا ہونے کا ہے، جب ہی غفلت کی بات بجا ہوسکتی ہے۔ الحاصل ایک خاص صورت حی علی الفلاح پر مقتدی اور امام کے کھڑے ہونے کا مسئلہ استحباب و ادب کا ہے، سنت واجب ہونے کا نہیں ہے اور پھر یہ وقت مستحب کی آخر حد بتائی گئی ہے نہ کہ اول وقت۔ اول وقت تو اس کھڑے ہونے کا ابتداء اقامت ہے تاکہ صفیں درست ہوسکیں اور امام ومقتدیوں کا تکبیر تحریمہ اپنے وقت پر ہوسکے۔

رہی بات عالمگیری اور حاشیۃ الطحطاوی کی عبارت کی تو اس میں بہت بڑی مسامحت ہوئی ہے۔ لہٰذا جو لوگ بصورتِ خاص حی علی الفلاح ہی پر کھڑے ہونے پر مصر ہیں اور قبل ازاں کھڑے ہونے والوں کو معتوب خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ جب یہ غلطی پر ہیں تو پھر وہ ائمہ جو اقامت کا وقت ہونے یا اقامت شروع ہوتے ہی مسجد کی اپنی سابق جگہ سے اٹھ کر محراب میں اپنے مصلی پر بیٹھ جاتے ہیں اور حی علی الفلاح پر اٹھتے ہیں وہ سنگین غلطی پر ہیں۔

.....✦.....

بقیہ ص ۸ کا..... رؤیت بھی ہے۔ اس کو سہیلیؒ نے ذکر فرمایا اور علی ما یریٰ فرمایا نہ فرمایا فیما یریٰ کیوں کہ ان کو نفسِ رؤیہ باری تعالیٰ میں جھگڑا تھا نہ کہ خصوصاً مرئی میں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دو دفعہ دیکھا۔ ایک دفعہ آنکھ سے، دوسری دفعہ فواد سے۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط رجالہ رجال الصحیح۔ مسند دارمی میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کا شرح صدر فرمایا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا قلبٌ وکیع لہ اذنان سمعتان و عینان بصیرتان. وکیعٌ یعنی متینٌ شدیدٌ یعنی مضبوط۔ پھر فرمایا ولقد راٰہ نزلۃً اخریٰ یہ بھی دونوں رؤیتوں کو شامل ہے لیکن رؤیت جبرئیل یہ تو ظاہر ہی ہے لیکن باری تعالیٰ کی رؤیت سو اس کے قرب کے باعث ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے یطلع اللّٰہ علیٰ اھل الجنۃ فیقول ھل رضیتم. سدرۃ المنتھیٰ اس کا تعلق رائی سے ہے نہ کہ مرئی سے جیسا کہ طبری نے فرمایا جیسے رأیت الھلال من المسجد. قولہ اذ یغشی السدرۃ ما یغشیٰ یعنی انوار اور تجلیات۔

نسائی شریف میں ثم اتیتُ سدرۃ المنتھی فغشیَتنی ضبابۃ فخررت لہٗ ساجداً اور یہی ظل من الغمام ہے، پھر فرمایا ما زاغ البصر وما طغیٰ اس میں تصریح فرمائی کہ یقظہ میں ہوا، پھر خلاصہ بیان فرمایا لَقَدْ رَاٰی مِن اٰیٰت ربہ الکبریٰ یہ بھی عام ہے جو کچھ وہاں دیکھا سب کو شامل ہے، حدیث ابی ذرؓ میں ہے رأیتُ نوراً اور نورٌ اَنّٰی اُراہُ اس کے معنی ایک ہی ہیں۔ ای ھو نورٌ من این رأیتہٗ اور مروزی نے بھی امام احمد سے پوچھا تو حدیث مرفوع ہی جواب میں کہی۔ رأیت ربّی پھر مسند کی حدیث میں ہے رأیت ربی عز و جل (اس کی سند قوی ہے)

.....✦.....

دارالعلوم دیوبند کا پیغام اور اس کے مقاصد

✦ تحریر: ادیب اریب حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانویؒ
✦ اردو ترجمہ : محمد سالم بستوی، محمد راشد اعظمی
شرکائے ادب عربی ۱۴۳۵ھ، جامعہ ہذا

جامعہ میں شعبۂ عربی ادب بھی قائم ہے، جس میں درسیات سے ہٹ کر اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمے کی مشق کرائی جاتی ہے، زیرنظر مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں عربی ماہ نامہ ''الداعی'' کے صدسالہ نمبر کے ایک خاص مضمون کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو گذشتہ شمارے کے ترجمے کی طرح یہ ترجمہ بھی پسند آئے گا اور اساتذہ وتلامذہ کی اپنے موضوع سے دل چسپی کا کسی قدر اندازہ ہوگا۔

ہمارے لئے دارالعلوم کا پیغام اور اس کے مقاصد کو دوسطروں میں بیان کرنا ممکن ہے اور وہ دارالعلوم کا مقصد اور اس کا پیغام مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی، چھینی گئی حکومت کی واپسی، نیز تمام گوشوں اور پہلوؤں سمیت اسلامی تعلیمات اور دینی علوم کی حفاظت ہے۔

قیام کا پہلا مقصد : جب ہم اس مدرسہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں، اس کی ورق گردانی کرتے ہیں، اس کے کارناموں کا رجسٹر کھولتے ہیں اور اس کو اس کے مقاصد کی روشنی میں جانچتے ہیں تو ہم حیرت و استعجاب، قدر افزائی اور شکر گذاری پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بانیان بالخصوص حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور ان کے تلامذہ دونوں مقاصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ رہا پہلا مقصد یعنی سامراجی چنگل سے اسلامی حکومت کی واپسی تو وہ آزادیٔ ہند، قیام پاکستان اور نتیجتاً دیگر اسلامی ممالک کی آزادی کی شکل میں پورا ہوا۔ یہ سب کچھ ہمارے علماء کی مثالی جدوجہد اور اس راستے میں بڑی بڑی قربانیاں دینے کے نتیجہ میں ہوا۔ چنانچہ ان کی قربانیوں، انگریزی عدالتوں اور قیدخانوں میں ان کے جرأت مندانہ موقف میں کوئی بھی ان کی برابری نہیں کرسکتا۔

اخلاصِ نیت : اس جماعت کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے تمام قربانیاں، تکلیفیں اور

مصیبتیں صرف اللہ کے یہاں اجر حاصل کرنے کے مقصد سے برداشت کیں۔ یہ ایسی مثال ہے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ جو بھی علماءِ دارالعلوم دیوبند کی قربانیاں جاننا چاہتا ہے، اسے ان کی تاریخ، ان کے حالات اور ان کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اسی سے اس کو معلوم ہوجائے گا کہ اس مدرسہ کی بنیاد ایک انقلابی شخصیت اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں رکھی گئی اور وہ تھے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ جن کے مدرسہ سے اور جن کے سایہ شفقت کے تحت اپنے استاذ اور مرشد کے نقش قدم پر چلنے والے بہت سے نیک فضلاء تیار ہوئے، مثلاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، پھر ان کے ہزاروں پیروکار اور تلامذہ جو اپنی قربانیوں اور طویل جدوجہد آزادی میں مشہور ہوئے۔ جو صرف ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے نہیں تھی، بلکہ تمام اسلامی ممالک کو آزاد کرانے اور مسلمانوں کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلانے کے لئے تھی۔ اس وقت کوئی ایسا مدرسہ نہیں تھا جو اسلامی نسل کے لئے غیور مجاہدین کی ایک ایسی فوج تیار کرے جن کے قلوب نورِ ایمانی سے منور ہوں، ان کی ارواح انابت الی اللہ سے مستحکم ہوں اور کفار کے دلوں پر جن کا رعب طاری ہو، جن کی آواز مسجد کے منبر سے، خطابت کے اسٹیج اور مسند تدریس سے بلند ہوئی اور میدانِ جنگ میں جن کی تلواریں چمکیں اور راتوں کو جن کی آوازیں گریہ کناں ہوئیں ہوں، جو مسلمانوں کے لئے رحم دل ہوں، اللہ کے دشمنوں اور کفار کے لئے سخت اور جن کا علم پیاسوں اور طلبہ کے لئے چشمہ فیاض ہو۔

قیام کا دوسرا مقصد : رہا دوسرا مقصد یعنی اسلامی تعلیمات، دینی علوم کی حفاظت، اسلام کی شان وشوکت اور شعائرِ اسلام کی بقاء تو وہ حیرت انگیز شکل میں پورا ہوا۔ چنانچہ یہ مدرسہ ان سازشوں سے جو دشمنانِ اسلام، اسلام کی صورت مسخ کرنے اور اس کی تاثیر کو کمزور کرنے کے لئے کررہے تھے، ایک پل کے لئے بھی غافل نہیں رہا۔ لہٰذا اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھانے والوں کے لئے لازم تھا کہ وہ مثبت ومنفی پہلوؤں کو اپنے اوپر لازم کرلیں، یعنی دفاعی پالیسی اور اقدامی پالیسی اپنائیں، اسی طرح علماء، نیز بڑی اور چھوٹی تمام ذمہ داریوں کو اٹھانے والی شخصیات کو پیدا کرنے کے لئے اس مدرسہ کی تعلیم کا جامع اور ضامن ہونا ضروری تھا، جو امت مسلمہ کی دینی، اعتقادی، معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کریں، ظلم وستم ختم کریں اور تباہ کن طوفانوں کو روکیں، جس کے نتیجے میں علوم وفنون اور محاسنِ اخلاق کی جامع شخصیات پیدا ہوئیں، جنہوں نے ہر میدان میں ایک ماہر اور تجربہ کار کی طرح کام کیا، اگر محاسن وعلوم کی یہ جامعیت نہ ہوتی تو اس دیار میں اسلام کی شان باقی نہ رہتی، مساجد اور مقدس مقامات محفوظ نہ رہتے اور بیہودہ لوگوں کے ہاتھوں سے اسلامی تہذیب کو بچانا ناممکن ہوجاتا۔

قوم مسلم کی رہ نمائی : چنانچہ اس مدرسہ نے اپنی تمام تر توجہ ایسے علماء اور مشائخ کو تیار کرنے پر مبذول کردی جن کے ہاتھوں پر لاکھوں لوگوں نے توبہ کی، جن کے ذریعہ اُن کی اصلاح ہوئی اور بہت سے

غیر مسلم ان کی سیرت اور اخلاق کی وجہ سے جو حضور ﷺ کی سنت کے مطابق ڈھلے ہوئے تھے، اسلام قبول کیا۔ اسی طرح اس مدرسہ سے بہت سے ماہر اساتذہ نکلے جن سے طلبہ وعلماء کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا اور ہندو پاک اور ان کے پڑوسی ممالک کے اکثر اسلامی مدرسے اب بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

اس مدرسہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ مدرسہ اساتذہ وافراد کے سلسلے میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں رہا بلکہ ہمیشہ بیک وقت مختلف اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے باصلاحیت اساتذہ مانگنے والے مدارس کو ان کی شرائط کے مطابق قابل استاذ فراہم کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہندوستان اور پاکستان کے اکثر بڑے اسلامی مدرسوں میں مدرسین کی ایک بڑی تعداد نظر آئے گی جو اس مدرسہ سے براہِ راست فارغ التحصیل ہیں یا ان کے تلامذہ اور عقلی ونقلی علوم: یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اصول اور لغت کے ماہر ہیں۔

فضلاء کی ہمہ جہتی خدمات : اس طرح اس مدرسے سے بہت سے علماء اور خطباء نکلے جن سے شہروں، دیہاتوں، میدانی اور پہاڑی علاقوں میں مسجدیں آباد ہوئیں، نیز بہت سے ماہر مفتیان کرام پیدا ہوئے، جن کے فتاویٰ نے ایک عظیم فقہی انسائیکلو پیڈیا کی شکل اختیار کر لی ہے ان میں سے اکثر فتوے کئی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، جن سے عام وخاص استفادہ کر رہے ہیں۔ اس مدرسے نے بہت سے دانشور، پیشوایانِ مذہب، سیاسی قائدین اور تحریکوں کے رہنماؤں کو جنم دیا، نیز کثیر تعداد میں واعظین، دُعات، مصنف، قلم کار، صحافی اور مناظر پیدا کئے، جنہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے اور اب بھی دے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ کسی شخص کے صحافی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا دوسرے معاملات سے کوئی سروکار نہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں صحافی ہوتا تو دوسرے وقت میں زاہد، قائد، واعظ، مناظر یا خطیب بھی۔

دفاع اور اقدام : دارالعلوم نے دوسرے مقصد میں دفاعی اور اقدامی دونوں اعتبار سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ رہی اقدامی اعتبار سے کامیابی تو تعلیم، وعظ، نصیحت، تقریر وخطابت، تصنیف وتالیف اور بیعت وارشاد کے ذریعے ہوئی جب کہ دفاعی اعتبار سے تو کبھی مناظرہ کے ذریعہ اور کبھی تصنیف وتالیف اور تحریر کے ذریعے۔ اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھے جانے کے روز اوّل سے ہی یہ بات مقدر کر دی تھی کہ دارالعلوم اپنا فرض پورا کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ وہ دارالعلوم کے افراد کے خلوص اور ان کے جذبۂ صادق کا امتحان لے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد پورا کیا۔

فتنوں کی سرکوبی : دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھے جانے کے وقت مسیحی مشنری کا زہر پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ان کے عقائد سے منحرف کرنے کے لئے بہت سے پادری اور عیسائی مبلغین ہندوستان بھیج رکھے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا

رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمہا اللہ اور اس مدرسے کی ایک دوسری جماعت نے ان کا پوری شدت سے مقابلہ کیا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ پھر انگریزوں کی ماتحتی میں قادیانیت کا فتنہ کھڑا ہوا، جو طرح طرح کے دھوکہ باز اور فریب کار پیدا کرتے تھے، علماء دارالعلوم نے عوامی مناظروں، کتابوں اور رسائل کی اشاعت کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا، قادیانیت اور عیسائیت کے رد میں بہت سے رسائل اور کتابیں تالیف کیں، خصوصاً حضرت علامہ کشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے۔ اس طرح اسلامی تعلیمات کو درپیش جو بھی اعتقادی یا نظریاتی فتنہ رونما ہوا، دارالعلوم کے فضلاء نے ہر طرف اور ہر جگہ کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔

طریقۂ تعلیم اور اس کے ثمرات : جب ہم تقریر و تالیف کے پہلو کو موضوع بحث بناتے ہیں تو ہمیں بہت سے مشہور و معروف افراد نظر آتے ہیں جنہوں نے وقت اور زمانے کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق کارنامے انجام دیئے۔ چنانچہ اردو اور عربی زبان میں علم سے بھرپور بکثرت قیمتی کتابیں ہیں جنہوں نے علماء اور طلبہ کو وسعت ذہنی بخشی اور علم دین کی خدمت کی۔ اس مدرسہ پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ یہ مدرسہ دین اور عقیدہ کا مضبوط قلعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو بیرونِ ہند حدیث شریف کی خدمت کے میدان میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ اس مدرسے کے اولین محدثین و اساتذہ نے خدمتِ حدیث پر اس طریقے سے خوب توجہ دی جو علم کے مختلف پہلوؤں یعنی اصول و فروع کو محیط اور اس کا نصاب حدیث روایت اور درایت کو جامع تھا، حتی المقدور باہم متعارض روایتوں کے درمیان تطبیق سے دلچسپی، ائمہ فقہ رحمہم اللہ کے مذاہب کو بیان کرنے، ان کے دلائل پر کلام کرنے اور حدودِ ادب سے تجاوز کرنے والے اور علم کی عظمت کو گھٹانے والے تعصب کا سہارا لئے بغیر، دیگر ائمہ کرام کی آراء انتہائی احترام کے ساتھ، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دینے کا پابند ہے۔ چنانچہ اسی مذہبی رواداری اور وسعت ذہنی کی وجہ سے سینکڑوں تشنگانِ علم حدیث اس مدرسہ کی دارالحدیث کا رخ کرتے ہیں اور حضور ﷺ کی احادیث سے لبریز دینی علوم کے ایک بہت بڑے ذخیرے کے ساتھ اپنے وطن لوٹتے ہیں۔ درسِ حدیث کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس جامعہ کے فضلاء فقط علم حدیث کے ایک بڑے ذخیرے کے حامل نہیں ہوتے بلکہ ورع و تقویٰ کے ساتھ ساتھ بلند اسلامی جذبہ اور دین کی خدمت اور شر کے خلاف جہاد کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں جو کہ دینی علوم اور حق و باطل کی معرفت کی بنیاد ہے۔

حدیث کی متنوع خدمات : حدیث شریف کے میدان میں اس مدرسہ کے علماء کی کوششیں درس کے کامیاب طریقوں میں منحصر نہ رہیں بلکہ ان کا دائرہ عربی اور اردو شروحات و تالیفات تک وسیع ہو گیا، مثلاً حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی صحیح مسلم کی عربی شرح ''فتح الملہم'' حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ کی سنن ترمذی کی عربی شرح ''معارف السنن'' حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کی مشکوٰۃ شریف کی عربی شرح

''التعلیق الصبیح'' اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خواہرزادے: حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ عربی تالیف ''اعلاء السنن'' بہ طورِ حصر نہیں بلکہ بطورِ مثال ہے کیوں کہ وقت ان کی تفصیل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مدرسہ کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک چیدہ جماعت نے متعین اور جامع اغراض و مقاصد کی خاطر رکھی جو دین کی حمایت و نصرت اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کے ضامن ہوں، اس مدرسے نے کماحقہٗ اپنا پیغام انجام دیا اور امید کے مطابق اپنے مقاصد کو ثابت کر دکھایا بلکہ امید سے کہیں بڑھ کر۔

الھامی مدرسہ، الھامی طریقہ : اس مدرسہ کا آغاز اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور اس کی نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے ایک شاگرد اور ایک استاذ کے ہاتھوں ایک معمولی جگہ پر ہوا، جو حیرت انگیز طور پر جلد ہی ترقی کر کے اُبھر کر سامنے آیا اور برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ وسطِ ایشیاء میں ایک بڑی اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا جو متعلقہ تمام علوم کے ساتھ دین کے اصول و فروع کے جامع نصاب کا حامل ہے، اس مدرسہ کو مسلم قوم میں تقدس کے ساتھ ساتھ تعظیم و تکریم ملی، چنانچہ اس کے بڑے بجٹ کا دارومدار توکل علی اللہ کے بعد صرف عوامی چندوں پر ہے۔

سادگی و فروتنی : یہاں پر جس چیز کو ذکر کرنا ہمارے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں انتہائی تواضع، معمولی زندگی، اخفائے ذات اور عمدہ کارنامے انجام دینا اس مدرسہ کے افراد کار اور علماء کا معمول رہا، شہرت اور نام و نمود کے پیچھے بھاگے بغیر اور خدمات کی تعداد کی نشر و اشاعت سے دلچسپی لئے بغیر۔ اس وجہ سے کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے اگر عالم اسلام میں ہمارے اکثر بھائی اس مدرسہ کی بلند و بالا عمارتوں، اس کے عظیم الشان کارناموں، اس کی مختلف خدمات اور ہندوستان، پاکستان، افریقہ، ملیشیا وغیرہ دنیا کے ملکوں کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے اس کے فارغین کی کثرت کے باوجود اس مدرسہ سے ناآشنا ہوں جب کہ انہیں وہ ادارے اور مدارس یاد ہوں جو دارالعلوم دیوبند کی بہ نسبت عمارتوں، نصابِ تعلیم، روحانی تربیت، طلبہ کی تعداد، کشادہ لائبریری اور دوسری مختلف خدمات کے اعتبار سے بہت چھوٹے ہیں کہ اس جامعہ نے نمائش اور ادعاء سے دلچسپی نہیں لی اور حق کا فیصلہ اصحابِ بصیرت و انصاف پر چھوڑ دیا۔ ان خدمات کے پیچھے اس کا مقصد صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول تھا اور اللہ تعالیٰ اس جامعہ اور اس کے علماء دونوں سے راضی بھی ہو گیا۔ چنانچہ ان کے مشن اور پیغام کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت اور مدد فرمائی۔ جاہلی عصبیت کے حامل بہت سے معاندین اور کینہ پروروں نے اس مدرسہ کے علماء پر بہت سی تہمتیں لگائیں، کبھی تو قدامت پسندی کی، کبھی جمود کی اور کبھی پسماندگی کی لیکن اِس ادارہ کے علماء نرمی، تواضع اور حق و صبر کی تلقین کرنے کے ساتھ اپنے اوپر ڈالی جانے والی مٹی اور اڑنے والے غبار کی طرف توجہ کئے بغیر اپنے مشن میں لگے رہے۔

اعتراف حقیقت : اسلام کی عزت کی حفاظت، دین کی خدمت اور حق کے جھنڈے کو بلند کرنے کے سلسلے میں اس مدرسہ کے علماء کے جہاد اور اسلامی علوم میں پختگی کے سلسلے میں بڑے بڑے علماء اور دین داروں نے اس جامعہ کی فضیلت کا اعتراف کیا، ان میں سرِ فہرست حضرت علامہ رشید رضا مصری مجلّہ منار کے مدیر ہیں۔ جنہوں نے دیوبند کا دورہ کیا اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ حدیث شریف کے موضوع پر بات کی اور تحقیق و تنقیح کا ایک عجیب وغریب اسلوب حضرت سے سنا تو بے حد متاثر ہوئے اور آپ کی لیاقت کے دل دادہ ہوگئے اور مجلّہ منار میں تبصرہ کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کے علماء کو سراہا۔

گر نہ بیند بہ روز ..... : وہ حقیقت جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں یہ ہے کہ علماء دارالعلوم پر تعصب اور جمود کا الزام لگانے والے درحقیقت خود ہی بہت زیادہ متعصب اور تنگ نظر ہیں، لیکن جن لوگوں نے علماءِ دارالعلوم کو قریب سے دیکھا انہوں نے ان کو ویسا ہی پایا جیسا علامہ رشید رضا مصری رحمۃ اللہ علیہ نے پایا۔ اس کے برعکس جیسا کہ یہ الزام لگانے والے بتاتے ہیں، اس کے برعکس اگر ان الزام تراشیوں کو پرکھا جائے تو یہ تعصب اور جمود کی مثال نظر آئیں گے جب کہ علماء دیوبند نے اہل سنت والجماعت کے حقیقی طریقہ پر کتاب وسنت سے ثابت سنتِ نبوی کی اصلی شکل پر عمل کیا اور حضور ﷺ کے قول "**ما أنا علیه و أصحابی**" اور آپؐ کے قول "**علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین**" کی حقیقت کو جانا، چنانچہ اس جماعت نے قرآن و سنت سے روشنی حاصل کئے بغیر صرف اور صرف اسلاف واکابر پر ہی اعتماد نہیں کیا۔ کتاب وسنت کو سمجھنے میں اس جماعت کی رائے اسلاف کے علمی کارناموں ان کے ذوق اور ان کے طریقہ سے الگ نہیں رہی بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں سلفِ صالحین کی رائے ان کے موروثی علمی ذوق سے استفادہ کے ساتھ کتاب وسنت کے مفہوم کو سمجھنے میں سلف صالحین کی اتباع ان کا شعار بن گیا، اسی لئے وہ علمی اور فکری اعتبار سے گمراہ نہیں ہوئے۔

سلف صالح کا احترام : اسی وجہ سے ہم بلند پایہ علماء کی ایک تعداد دیکھتے ہیں جو اس جامعہ سے فارغ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے وسیع علم، فہم سلیم اور تیز ذہن سے نوازا اور مسائل واحکام میں اجتہاد واستنباط کی صلاحیت عطاء کی۔ چنانچہ ان کے رسوخ فی العلم کی وجہ سے ان کے اندر تواضع، ائمہ مہدیین اور محدثین کی اتباع اور ان کے احترام میں اضافہ ہی ہوا، علوم میں مہارت اور ان میں انفرادیت نے ان کے اندر خودستائی اور رائے میں تفرد پیدا نہیں کیا اور یہی اس مدرسے کے علماء کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، جس کا اعتراف اس مدرسے کی زیارت کرنے والوں، ان کے ساتھ بود باش رکھنے والوں، ان کے ذریعہ آراستہ و پیراستہ ہونے والوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے کیا۔

قدامت و اصالت پر استقامت : بہرحال! اگر ہم تعلیمی نظریئے اور طریقہ تربیت کی بات

کریں تو اس بات کے اعلان کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ یہ جامعہ ہمیشہ سے اپنی تربیت اور تعلیم کے طریقے میں اپنی قدیم روش پر قائم رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں مکمل توفیق عطاء کی۔ بعض علماء نے اس طریقے کی مخالفت کی اور اس تعلیمی نہج کو تبدیل کرنے اور جدید طریقۂ تعلیم اپنانے کے لئے صدائے احتجاج بلند کیا لیکن وہ اپنے اس مشن میں ناکام ہوگئے اور ایک ایسی باصلاحیت علماء کی جماعت تیار کرنے سے عاجز رہے جو دین کی حفاظت اور اس کی نشر واشاعت کی دل دادہ ہو۔ چنانچہ ہندوستان میں قدیم وجدید طرز کو جامع لمبے چوڑے دعووں اور دلکش منصوبوں کے ساتھ چند مدرسے قائم ہوئے، لیکن ان مدارس سے چند ایسے لوگ نکلے جو مسجد میں امامت، عوام کے ساتھ گھلنے ملنے، مدارس میں پڑھانے اور مختلف میدانوں میں اسلام کی خدمت کے لئے مصائب اور پریشانیاں برداشت کرنے کو حقیر جانتے ہیں اور معمولی تنخواہ کے ساتھ تنگی کی زندگی گذارنے پر راضی نہیں، چنانچہ وہ سرکاری امتحانات میں پاس ہونے کے بعد سرکاری محکموں اور عصری یونیورسٹیوں میں ملازمت کرنے لگے۔

اس طریقہ کی وجہ سے اس مقصد کی روح ہی بدل گئی، جس کے لئے یہ قوی دینی ادارے قائم ہوئے جو مسلمانوں کے اشاعتی مراکز اور عقیدے کے دفاع کے لے سپاہی تیار کرتے ہیں جب کہ ان مدرسوں کے طلبہ ان اقدار سے خالی ہوگئے جن کا اسلام متقاضی ہے اور جو ان مدارس کا مقصد ہیں۔ اگر ہندوستان میں تمام مدرسے نئے طریقے پر قائم ہوجاتے تو ان کا پیغام ختم ہوجاتا اور ان کا شمار بھی ان مدارس میں ہوتا جن کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے، پھر یہ مدرسے ایک ایسی تعلیم یافتہ جماعت نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جو دنیاوی امور انجام دینے، بڑے بڑے منصب پر فائز ہونے اور اعلیٰ مرتبے حاصل کرنے کے اہل ہوجائیں۔

جہاں تک تعلق دارالعلوم دیوبند کا ہے تو اس نے روزِ اول ہی سے اس مضبوط راستہ کو اپنایا جسے علماء ربانیین بانیان نے طے کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو روشنی، بصیرت اور اخلاص سے نوازا۔ ایک ایسا طریقہ کار جو مسلسل پسندیدہ نتائج دیتا رہا تغیر وتبدیلی میں وہ پتھر کی طرح ٹھوس نہیں، اگر اسلامی مصلحت اس کی داعی ہو اور نہ ہی ترٹہنی جیسا تھا جس کو آندھیاں اور طوفان اڑاتے پھریں۔ اپنے اوپر قدامت کے لقب سے اس کو کوئی شرمندگی نہیں ہوئی، نہ جدید کے راگ نے اسے مرعوب کیا، نہ اس نے جدید وقدیم کو یک جا کرنے کی کوشش کی بلکہ اس نے اپنے ورثہ اور اقدار کی حفاظت کے تقاضہ کے پیش نظر قدیم کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور اسلامی مصلحت کے تقاضہ کی حد تک جدید کو بھی اپنایا اور اس چیز نے اصل مقصد اور اس کی تعمیر میں خلل نہیں ڈالا، اسی بنیاد پر بقدرِ ضرورت اس کے تعلیمی اور نظم ونسق کے طریقوں میں بہت سی ترمیمات ہوئیں، مگر اس اسی حد تک نہیں جو اس کو مذہبی خصوصیتوں اور بنیادی مقاصد سے دور کردیں۔

افراد کار کی تیاری : دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی اور تدریسی طریقہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ

جامعہ ہر سال مطلوبہ معیار کے حامل علماء کی ایک جماعت پیدا کرتا ہے۔ دورِ حاضر میں اسلامی معاشرے کو اپنی اصلاح، ذہن سازی اور تعلیم یافتہ بنانے کے لئے جن کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ بعض تو محقق ہیں، بعض عصری اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہیں، بعض عربی مدارس میں ماہر استاذ ہیں، بعض کامیاب مصنف ہیں، بعض دین دار صحافی ہیں اور کوئی موثر و فصیح خطیب، ادیب، شاعر، لیڈر، قائد، موذن، امام، تاجر اور صنعت کار ہیں۔ چنانچہ فارغین دارالعلوم دیوبند کے زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہونے کی وجہ سے اس جامعہ کا پیغام عام ہوا۔ یہ مسلمانوں کے تمام طبقات اور ہر جگہ سے اچھی طرح مربوط ہوگیا۔ ان حضرات کے ذریعہ صدائے اسلام پھیلی، دور اور قریب کے خطوں میں مذہبی سرگرمی کو فروغ ملا اور ہر ایک نے اپنی انفرادی اور شخصی محنتوں سے وہ کارنامہ انجام دیا جو بعض حکومتوں کے بس کی بات نہیں تھی، جس شخص کو اس سلسلے میں شک وشبہ ہو تو اطراف ہندو پاک، بنگلہ دیش کا سفر کرے تاکہ اسے اس جامعہ کی آواز کی درازی اور اس کے پیغام اور خدمت سے واقفیت ہو، اگرچہ بہت سے بیرونی علماء اس سے ناواقف ہیں۔

خلاصۂ بحث : ایک طرف اس جامعہ نے بڑی بڑی شخصیات اور افراد پیدا کئے، جن کی وجہ سے علم دین سربلند ہوا، دین کو روشنی ملی، اصلاح احوال کا معرکہ گرم ہوا، ان حضرات کے قلم سے کتابیں آراستہ ہوئیں اور ان کے افکار سے ذہن وسیع ہوئے جس کو بھی اس بارے میں شک ہوا سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہئے، نیز ان بہت سے علماء کے حالات کا جن کے ہاتھوں بہت سے لوگ راہ یاب ہوئے۔ عقلاء، قابل اعتماد اور بڑے بڑے علماء اور محققین نے ان حضرات سے رجوع کر کے استفادہ کیا، دین کی سمجھ، نفس کی اصلاح اور اخلاق کو سنوارنے میں ان سے روشنی حاصل کی۔ جو باتیں ہم نے ذکر کی ہیں وہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں جو بے حقیقت ہوں بلکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو اس جامعہ اور اس کے بلند پایہ علماء کی خدمت کو کماحقہٗ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

.....✦.....

مسائلِ قربانی وحج

✦ مولانا مفتی نثار خالد قاسمی
استاذ حدیث جامعہ ہٰذا

سوال : قربانی دوسروں سے کروانا کیسا ہے؟

جواب : جس شخص کو جانور ذبح کرنا آتا ہے اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ذبح کرے ورنہ پھر دوسروں سے کروائے اور ذبح کرتے وقت اس جگہ موجود رہے۔ **و ندب ان یذبح بیدہ ان علم ذالك ..... الی ..... فالاحسن ان یستعین بغیرہ الخ** (بحرص۳۲۸،ج۸)**و فی نصب الرایہ للزیلعی** (ص۵۱۴،ج۴)**قال علیہ السلام لفاطمۃ: قومی فاشھدی اضحیتك فانہ یغفر لك باول قطرۃ من دمھا کل ذنب.**

سوال : زید وشاکر دو بھائی ہیں، دونوں نے اپنا اپنا قربانی کا جانور خریدا مگر بوقت قربانی زید نے شاکر کا جانور اور شاکر نے زید کا جانور قربان کر دیا۔ ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ دونوں کی قربانی صحیح ہوئی یا نہیں؟

جواب : صورتِ مسئولہ میں زید اور شاکر دونوں میں سے ہر ایک کی قربانی اس کے اپنے خرید کردہ جانور سے ہوگئی کیوں کہ قربانی کے جانور قربان کرنے میں قربانی دینے والے کی طرف سے بہ صراحت یا بدلالت اجازت ملنے پر کسی دوسرے شخص کا جانور کے ذبح کرنے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ بدائع میں لکھا ہے: **و علی ھذا لو غلط رجلان فذبح کل واحد منھما اضحیۃ صاحبہ عن نفسہ انہ یجزئ کل واحد منھما اضحیتہ عن نفسہ استحسانا و یأخذھا من الذابح.** (ص۲۷۸،ج۶)وکذا فی البحر(ص۳۲۸،ج۸)

سوال : ایک آدمی کی بکری کا بچہ پیدا ہوا اس نے اس کو قربانی کرنے کی نیت کر لی، پھر وہ بچہ ایک سال سے زیادہ عمر کا ہوگیا، تو کیا اس کے اس نیت کر لینے سے اس پر اس بچہ کو قربانی کرنا ضروری ہوگا؟

جواب : مذکورہ بالا صورت میں اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس بچہ کو قربانی کرنا ضروری نہیں ہے۔ **ولو کان فی ملك انسان شاۃ فنوی ان یضحی بھا لا یجب علیہ الخ.** (بدائع ص۲۶۴،ج۶)

سوال : ایک مال دار شخص ہے، اس نے قربانی کی منت مان رکھی ہے، اب قربانی کے ایام آ گئے، تو اس کے ذمہ کتنی قربانی کرنی ضروری ہوگی؟

جواب : درصورتِ مذکورہ اس کے ذمہ دو جانور کی قربانی کرنی ضروری ہوگی، ایک قربانی تو منت والی اور دوسری وہ جو اس کے مال دار ہونے کی وجہ سے اس کے ذمہ واجب ہوئی ہے۔

ولو نذر ان یضحی بشاۃ..... و لو قال ذالك قبل ایام النحر یلزمه التضحیة بشاتین بلا خلاف. (بدائع ص ۲۶۷، ج ۶)

سوال : ایک نومسلم مال دار شخص ہے جو قربانی کے تیسرے دن مسلمان ہوا ہے، اب اس کے ذمہ قربانی کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

جواب : قربانی کا وقت تین دن ہے ۱۰/۱۱/۱۲ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ قربانی کے پہلے دن کے شروع حصہ سے لے کر تیسرے دن کے آخری حصہ تک آدمی مسلمان رہے جیسا کتب فقہیہ میں مصرّح ہے۔ لہٰذا جب وہ تیسرے دن کے ختم ہونے سے قبل مسلمان ہوگیا ہے اور وہ مال دار بھی ہے تو پھر اس پر قربانی کرنا ضروری ہوگا۔ **منها انها تجب فی وقتها وجوباً موسعاً الخ.** (بدائع ص ۲۷۴، ج ۶)

سوال : ایک شخص سفر حج پر جانے والا ہے اور اس نے بارادۂ قربانی ایک جانور خرید لیا ہے تو کیا اس پر اس جانور کا قربانی کرنا ضروری ہوگا؟

جواب : بارادۂ قربانی جس شخص نے جانور خریدا ہے اور وہ مال دار ہے تو پھر سفر حج پر جانے کی وجہ سے اس پر اس کی قربانی کرنی ضروری نہیں ہے کیوں کہ وہ سفر حج پر جانے کی وجہ سے مسافر ہے اور مسافر کے ذمہ قربانی نہیں ہے اور یہ جانور بارادۂ قربانی خریدے جانے کی وجہ سے قربانی کے لئے متعین نہیں ہوا ہے۔ البتہ اگر وہ صاحب نصاب نہیں ہے اور بارادۂ قربانی جانور خرید چکا ہے تو اب یہ جانور قربانی کئے جانے کے لئے متعین ہے۔ لہٰذا ضروری ہوگا کہ سفر حج پر جانے والا کسی کو اپنی جگہ اس جانور کو ایامِ قربانی میں قربان کرنے کا حکم کر جائے۔ **من المشائخ من فصل بین الموسر والعسر فان کان موسراً فالجواب کذالك لانه ما اوجب بهذا الشراء والنیة شیئا علی نفسه و انما قصد به اسقاط الواجب عن نفسه الخ.** (بدائع ص ۲۶۹، ج ۶)

سوال : زید کا انتقال ہوگیا، اس کے بیٹوں میں ایک نابالغ بیٹا بھی ہے اور زید نے ترکہ میں کافی جائیداد چھوڑی ہے۔ وارثت کے قاعدہ سے مرحوم زید کا نابالغ بیٹا بھی بہت زیادہ اموال کا مالک بنا ہے، سامنے قربانی کے ایام آرہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مرحوم زید کے اُس نابالغ بیٹے پر قربانی کرنا ضروری ہے۔

جواب : مفتی بہ قول کے مطابق زید مرحوم کے اس نابالغ بیٹے پر قربانی کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے **و روی عنه انه لا یجب عن ولده وهو ظاهر الروایة و قال قاضی خان و علیه الفتویٰ** (بنایہ ص ۱۳، ج ۱۲) **و کذا فی البدائع** (ص ۲۷۲، ج ۶ والبحر ص ۳۱۹، ج ۸)

سوال : ایک شخص کا اپنا ارادہ یہ ہے کہ ایک بڑا جانور خرید کر اس میں ایک حصہ قربانی کا اور باقی ولیمہ کا کرلیں گے اس طرح اس کی قربانی بھی ہوجائے گی اور ولیمہ کا پروگرام بھی بخوبی ہوجائے گا۔ تو کیا یہ درست ہے؟

جواب : ولیمہ سے مقصود اگر نکاح جیسی نعمت وسنت کے اپنانے کا شکر ادا کرنا ہے تو یقیناً یہ قربت ونیکی ہے جس طرح قربانی ہے۔ لہٰذا دونوں کو بایں صورتِ مذکورہ جمع کیا جانا درست ہے، البتہ قربت کی جہتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے حضرات شیخین کے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے۔ **روی عن ابی حنیفة انه کره الاشتراك عند اختلاف الجهة و روی عنه انه قال لو کان هذا من نوع واحد لکان احب الی.** (بدائع ص۲۹۲، ج۶)

سوال : ایک عورت حج کو گئی اور ابھی اس نے طوافِ زیارت نہیں کیا تھا کہ اس کو حیض آ گیا تو اب وہ کیا کرے گی؟

جواب : طوافِ زیارت حج کا رکن ہے اور اس کے لئے حیض ونفاس سے پاک ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جب اس کو طوافِ زیارت سے قبل حیض آ گیا تو اس کو اپنے پاک ہونے کا انتظار کرنا چاہئے۔ حیض سے جب پاک ہوجائے گی تو طواف کرے گی۔ واضح رہے کہ اندریں صورت جو تاخیر ہوئی ہے کہ ایام نحر گذر گئے جس میں طوافِ زیارت کا ہونا واجب ہے تو یہ اس کے حق میں کوئی جرم نہیں ہے کیوں کہ یہ منجانب خداوندی ہے، اس لئے اس کے ذمہ کوئی دم نہیں ہے۔

اور اگر وقت تاخیر کی اجازت نہ دے مثلاً ایام نحر گذرتے ہی رفقاء سفر روانہ ہوجائیں گے اور یہ قافلہ سے بچھڑ جائے گی یا ویزا کی مدت ختم ہوجائے گی تو پھر اسی حالت میں طوافِ زیارت کرلے اور ایک بڑا جانور خواہ وہ اونٹ ہو یا بھینس اس کی قربانی کردے جب چاہے، البتہ حدودِ حرم میں کرے۔ **فاما الطهارة عن الحدث و الجنابة والحیض والنفاس فلیست بشرط لجواز الطواف بل واجبة حتی یجوز الطواف بدونها (بدائع ص ٦٢، ج٣) وفی الشامی لو هم الراکب علی القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف ام لا؟ قالوا یقال لها لا یحل لك دخول المسجد و ان دخلت وطفت اثمت و صح طوافك و علیك بدنة.** (منقول از حاشیہ انوار مناسک، ص۳۴۶)

سوال : ایک شخص بغرض تجارت مکہ مکرمہ کا سفر کرے تو کیا اس پر ضروری ہے کہ احرام باندھے؟

جواب : جب کوئی شخص مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفاً یا حرم میں جائے اس کا یہ جانا خواہ حج یا عمرہ کے ارادے سے ہو یا سیر وتفریح یا تجارت کی غرض سے بہرصورت اس پر ضروری ہے کہ میقات پار کرنے سے قبل احرام باندھے۔ **و کذالك لو اراد بمجاوزه هذه المواقیت دخول مکة لا یجوز له ان یجاوزه الا**

محرماً سواء اراد بدخول مکة النسك من الحج او العمرة او التجارة او حاجة اخری عندنا الخ. (بدائع ص۱۵۹، ج۳، فیصل)

سوال : مکہ سے باہر رہنے والا ایک شخص حج تمتع کی نیت سے حج میں گیا ہے، اب وہ عمرہ کر کے حلال ہو گیا اور اس کو ایام حج سے قبل حج کا احرام باندھنا ہے تو وہ کہاں سے احرام باندھے؟

جواب : جب وہ عمرہ کے کاموں سے فارغ ہو کر حلال ہو گیا تو اب وہ اپنے دوران قیام باشندگان مکہ کے حکم میں ہے، لہٰذا جو مکہ والوں کی میقات ہے وہی اس کی بھی میقات ہے۔ چنانچہ وہ حج کے لئے اپنی جائے قیام (جو حدودِ حرم میں ہے) سے بھی احرام باندھ سکتا ہے۔ ویسے اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ حطیم میں آئے اور یہاں سے احرام باندھے۔ **لانه صار فی حکم اهل مکة بدلیل انه صار میقاتهم میقاته (بدائع ص ۱۷٤، ج۳) و فی الغنیة فاذا کان یوم التروية احرم به و قبله افضل وا فضل اماکنه الحطیم ثم المسجد الخ.** (برحاشیہ انوار مناسک، ص۶۸۴)

سوال : اگر کوئی شخص طوافِ زیارت نہ کر سکے اور گھر آ جائے تو اب اس کے لئے کیا یہ درست ہے کہ بیوی سے ہمبستر ہو نیز اس کے احرام سے کھلنے کی شکل کیا ہے؟

جواب : چوں کہ طوافِ زیارت یعنی اس کا سات چکروں میں تقریباً چار چکر لگانا حج کا رکن ہے اور باقی چکر واجب ہے کما فی البدائع ص۳۷، ج۳ **فالمقدار المفروض هو اکثر الاشواط وهو ثلاثة اشواط و اکثر الشوط الرابع** اور اس کا بدل اور قائم مقام بھی شریعت میں کوئی چیز نہیں ہے، اس لئے اس پر ضروری ہے کہ آئندہ جب موقعہ ملے بیت اللہ شریف جا کر طواف زیارت کرے اور یہ طوافِ زیارت نہ کرنا اگر منجانب اللہ کسی عذر کی وجہ سے ہے تو پھر اس کے ذمہ کوئی بھی دم واجب نہیں ہے ورنہ ہے۔

اور اس دوران وہ اپنی بیوی سے بالکل وطی و ہمبستری نہ کرے ورنہ جب جب وہ وطی کرے گا اس کے ذمہ ہر ایک وطی کے بدلہ ایک دم دینا واجب ہوگا بشرطیکہ پہلی وطی کے بعد والی وطی سے ترک احرام یعنی حلال ہونے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ **و اما حکمه اذا فات عن ایام النحر فهو انه لا یسقط بل یجب انه یأتی به لان سائر الاوقات وقته. ثم ان کان بمکة یأتی باحرامه الاول و ان رجع الی اهله فعلیه ان یرجع الی مکة باحرامه الاول ولا یحتاج الی احرام جدید وهو محرم عن النساء الی ان یعود فیطوف و علیه دم للتاخیر عند ابی حنیفة.** (بدائع ص۳۷، ج۳)

.....✦.....

جامعہ کی سرگرمیاں

✦ مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی
استاذ حدیث جامعہ ہذا

جدید داخلے کی کارروائیاں مکمل : جامعہ میں داخلہ کے خواہش مند طلبہ کی بڑی تعداد الحمدللہ روز افزوں ہے، ہر سال بڑی تعداد میں تشنگانِ علوم امتحان داخلہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ۴ رشوال المکرّم سے ہی جدید داخلے کی کارروائیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ درجۂ حفظ، عربی اول تا دورۂ حدیث شریف تکمیل ادب اور تکمیل افتاء میں داخلہ کے آرزومند طلبہ نے جوش وخروش سے حصہ لیا، مگر انہیں خوش نصیب بچوں کو داخلہ دیا گیا جو معیار پر کھرے اترے۔ ہر جماعت میں ہر سال کی بہ نسبت زیادہ داخلے دیئے گئے۔ ۲۴ رشوال المکرّم تک داخلے کی کارروائیاں پایۂ تکمیل تک پہنچیں۔ دریں اثناء قدیم طلبہ کے داخلے کی کارروائیاں بھی انجام پائیں۔ امسال یوں تو ہر درجے میں زیادہ طلبہ لئے گئے لیکن سب سے زیادہ طلبہ دورۂ حدیث شریف میں ہیں۔

تعلیم کا آغاز : جامعہ میں جدید داخلے کی کارروائیاں اگرچہ ۴ رشوال سے ہی شروع ہوئیں مگر جامعہ باقاعدہ ۱۰ رشوال سے کھلا، ۱۲ رشوال سے رواں سال کی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ آغاز سے پیش تر اساتذہ کو رہنما اصول دیئے گئے۔ تعلیمی بہتری کے پیش نظر بہت سی مفید تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ قدیم طلبہ اور اساتذہ وقت پر جامعہ میں تشریف لے آئے۔

اجراء مطبخ : جامعہ میں طلبہ کی تعلیمی لیاقت کو ملحوظ رکھ کر امدادی وغیر امدادی داخلے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو طلبہ معیاری اوسط کے ساتھ داخلہ پاتے ہیں جامعہ انہیں طعام وقیام کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ جن طلبہ کا داخلہ معیاری اوسط پر نہیں ہوتا انہیں طعام وغیرہ کی سہولیات نہیں دی جاتیں۔ سہ ماہی امتحان میں ۵۰٪ کا اوسط پانے پر انہیں امداد طعام پیش کی جاتی ہے۔ آغاز تعلیم کے ساتھ ہی الحمدللہ مطبخ بھی جاری ہو گیا اور مستحق طلبہ صبح وشام اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

مسجد انور شاہ میں خانقاہی سرگرمیاں : معلوم ہے کہ بانیٔ جامعہ فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے دو برس پیش تر جامعہ کی مسجد انور شاہ میں ماہِ

رمضان المبارک میں خانقاہی سلسلہ شروع فرمایا تھا جو تاوفات جاری رہا۔ حضرت کشمیریؒ کے بعد رئیس الجامعہ وشیخ الحدیث حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دام ظلہم نے اسے جاری رکھا، جامعہ کے استاذ حدیث مولانا محمد صغیر پرتاپ گڑھی زید مجدہم رمضان المبارک میں خانقاہی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ ہر سال کی طرح اس رمضان میں بھی انہوں نے خانقاہ چلائی۔ اس دوران تراویح کے بعد درسِ قرآن بھی دیئے۔ حاضرین کو مواعظ و تلقینات سے بھی مستفید کیا۔ مولانا پرتاپ گڑھی قطبِ دوراں حضرت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الٰہ آبادی دامت برکاتہم سے خلافت یافتہ ہیں اور انہیں اجازت صحبت کے ساتھ اجازت بیعت بھی حاصل ہے۔ رمضان میں مسجد میں قیام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد خیمہ زن رہی، جن کے افطار وسحر کا انتظام حسب سابق حضرت رئیس الجامعہ دام ظلہم کی طرف سے رہا۔ نمازی اور اعتکاف کرنے والے پچھلے کی بہ نسبت زیادہ رہے۔

دعوتی اسفار : رمضان کا مقدس ماہ شروع ہوتے ہی اساتذہ جامعہ دعوتی اسفار پر روانہ ہوگئے۔ محترم مولانا عبدالرشید بستوی صدر المدرسین جامعہ ممبئی تشریف لے گئے جہاں مختلف مقامات پر ان کے بیانات ہوئے۔ محترم مولانا مفتی وصی احمد بستوی ناظم تعلیمات جامعہ نے شیموگہ، کرناٹک کا سفر کیا، جہاں بعد تراویح اور فجر دو مسجدوں میں تفسیر کا سلسلہ رہا۔ محترم مولانا شیث احمد صاحب مظاہری امسال بھی سانگلی اور میرج تشریف لے گئے جہاں ان کے پرمغز خطابات ہوئے۔ مولانا محمد سعید پالن پوری استاذ جامعہ نے حسب سابق بنگلور کا سفر کیا۔ احقر فضیل احمد ناصری القاسمی بھی بمبئی کے میرا روڈ علاقے میں گیا جہاں تراویح سمیت تفسیر بھی ہوئی۔ مولانا مفتی نثار خالد قاسمی نے کلکتہ کا سفر کیا جہاں مختلف مساجد میں ان کے گراں قدر بیانات ہوئے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد ساجد قاسمی نے گودھرا، بڑودہ اور احمد آباد اور مولانا محمد ابوطلحہ اعظمی نے پونہ، ستارا، ممبئی اور کشمیر سمیت متعدد مقامات کا سفر کیا۔ **فجزاهم الله خير الجزاء۔**

دارالحدیث انور ہال کی تعمیر : جامعہ کی عظیم الشان عمارت دارالحدیث انور ہال کا تعمیری کام بدستور جاری ہے۔ بہت سارے مرحلے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے باوجود اب بھی کافی کام باقی ہیں۔ بالائی منزلوں سے بہت حد تک فراغت تو شعبان میں ہی ہوچکی تھی۔ رمضان سے تحتانی حصے کے نامکمل کاموں کو پورا کیا جارہا ہے۔ وسیع وعریض ہال میں قیمتی پتھر خوبصورتی سے نصب کردیئے گئے۔ ہال کے علاوہ چاروں طرف کے برآمدے میں تنصیب جاری ہے۔ یہ ساری تنصیبات فرش پر ہوئی ہیں، پتھر لگنے کے بعد گھسائی اور چکنائی کا مرحلہ بھی روبہ تکمیل ہے۔ قارئین سے اس کے جلد از جلد مکمل ہونے کے لئے دعاؤں کی درخواست ہے۔

تعلیمی بہتری کے لئے اقدامات : جامعہ میں طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لئے بہتر سے بہتر اقدامات کئے جاتے رہے ہیں، جن کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تعلیمی اوقات

میں طلبہ کے احاطۂ جامعہ سے باہر نکلنے پر مکمل پابندی ہے۔ اوقات تعلیم میں موبائل سخت ممنوع ہے۔ ملٹی میڈیا موبائل کی کسی حال میں اجازت نہیں۔ پنج وقتہ نمازوں میں حاضری ناگزیر ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ حاضری لی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً دیگر اقدامات بھی اٹھائے جاتے رہتے ہیں۔

۱۵/اگست کو جامعہ میں جلسہ : ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا وطن ہندوستان آزاد ہوا تھا، اسی آزادی کی خوشی میں پورے ملک میں قومی جشن منایا جاتا ہے۔ حسبِ سابق جامعہ میں ۱۵/اگست کو تعطیل رکھی گی۔ اس موقع پر مسجد انور شاہ میں ایک اہم اجلاس منعقد ہوا، جس میں تمام طلبہ اور اساتذہ کرام نے اپنی تقاریر میں تحریک آزادی ہند کے پس منظر پر مفصل روشنی ڈالی اور اکابر دیوبند کی قربانیوں کو یاد کیا۔

مولانا مفتی وصی احمد بستوی استاذ حدیث جامعہ نے اپنی تفصیلی تقریر میں کہا کہ تحریک آزادی میں سب سے بڑا حصہ مسلمانانِ ہند بالخصوص اہل دیوبند کا ہے، رہے برادرانِ وطن تو اس میدان میں ان کی آمد بہت بعد کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض نازک مواقع پر انہوں نے سامراج ہی کا ساتھ دیا، تاریخ اٹھا کر دیکھئے آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی صرف اس لئے ناکام ہوگئی کہ راجدھانی دہلی میں انگریزوں کے شانہ بشانہ گورکھا ہندو اور پنجاب کے سکھ بھی بے دریغ مجاہدین کی گردنیں کاٹ رہے تھے۔

جامعہ کے استاذ حدیث مفتی نثار خالد صاحب نے آزادی کی مرحلہ وار تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ سری رنگا پٹنم میں سلطان ٹیپو کی لاش کے پاس انگریز جنرل ویلزلی نے کھڑے ہوکر بڑے جوش سے یہ اعلان کیا تھا کہ آج سے ہندوستان ہمارا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ٹیپو کی شہادت تحریک آزادی کا سب سے اہم موڑ ہے، اس کے بعد باقی ہندوستان بہت جلد استعمار کا غلام بن گیا۔

معرف قلم کار اور دارالعلوم وقف کے استاذ جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے اپنے فکر انگیز خطاب میں حکومتی رویے اور موجودہ مسلم قائدین کے طرزِ عمل پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ ایک طرف حکومت ہماری قربانیوں کے ایک ایک نقش کو مٹانے میں لگی ہوئی ہے تو دوسری طرف ہمارے مذہبی زعماء اپنے خول میں مست صرف اپنی دوکان چمکانے میں مصروف ہیں۔

رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دامت برکاتہم نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک عظیم نعمت ہے، یہ ہر متنفس کا حق ہے، اسے سلب نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ بعض فرقہ پرستوں کی زہر افشانیوں اور حکومت کی مسلمانوں کے تئیں سرد مہریوں سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اس ملک کے حصہ دار نہیں۔ اگر ہمارے اکابر نے آزادی کی جنگ نہ لڑی ہوتی اور اس کے لئے منظّم منصوبہ بندی نہ کی ہوتی تو آزادی کا یہ خواب ہرگز ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکتا تھا۔ حضرت مدظلہٗ نے مزید فرمایا

کہ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ سرفروشی کی روشن تاریخ مرتب کرنے والے علماء اسلام اور مسلم نوجوانوں کی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا گیا اور گنتی کے ایک آدھ نام ہندی تاریخ کا حصہ بن سکے۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے ہماری نسلیں اپنی تاریخ سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہیں۔ انہیں ہمارے اکابر کی قربانیوں سے واقف کرانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پروگرام کی نظامت مفتی محمد ساجد قاسمی نے انجام دی اور محترم مولانا شیث احمد مظاہری کی دعا پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

واردین و صادرین : ماہِ شوال میں ۲۳؍افراد پر مشتمل ایک معزز وفد کی جامعہ میں آمد ہوئی۔ مولانا سہیل احمد قاسمی گودھروی کی قیادت میں آنے والے اس وفد کا مقصد شیخ الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مدظلہٗ کی زیارت کے ساتھ کچھ طلبہ کے داخلوں کی تکمیل تھی۔ یہ حضرات جو پہلے ہی سے جامعہ کی نیک نامی سے متاثر تھے قریب سے اس کی تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور دل سے اس کے ذمہ داران، اساتذہ اور کارکنان کو دعائیں دیں۔

الحاج جناب اسماعیل احمد سیٹھ صاحب جوارِ رحمت میں: نواگام، انکلیشور (گجرات) کے قریب ایک بہت ہی مختصر سا گاؤں ہے، جہاں آج بھی رسائی دشوار ہے اور آج سے لگ بھگ ۶۵؍سال پہلے تو بیل گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا یا پاپیادہ، اس بستی میں کشش اور جاذبیت کی صرف ایک وجہ وہاں کے سیٹھ برادران تھے، الحاج موسیٰ سیٹھ، ابراہیم سیٹھ، سلیمان سیٹھ، اسماعیل سیٹھ رحمہم اللہ اجمعین۔

اس صف کی آخری کڑی جناب حاجی اسماعیل احمد سیٹھ تھے جن کی وفات کے ساتھ ہی یہ پوری صف اللہ کے حضور پہنچ چکی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرت والد محترم مغفور ومرحوم کو لے کر گجرات کے چپہ چپہ پر اصلاحی وتبلیغی بیانات کرانا، اجتماعات کا انعقاد، مرحوم کا خاص ذوق تھا، انتہائی تواضع وخاکساری، نیکی واطاعت گزاری مزاج کا خصوصی حصہ تھا۔ عیدالاضحی کی تعطیلات میں پورے صوبہ گجرات میں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تبلیغی پروگرام ترتیب دیتے، بلاشبہ بعض علاقوں کے وہ فاتح بھی تھے۔ ایسے ایسے دور دراز گاؤں میں پروگرام رکھتے جہاں بدعات کی آندھیاں چلتی تھیں، بعض اوقات جلسوں میں سننے والے فقط چار نفر ہوتے، اسماعیل سیٹھ، داعی اور حضرت شاہ صاحبؒ واحقر، قیام کا موقع اور نہ طعام کی گنجائش، مگر اسماعیل سیٹھ ہمت نہیں ہارے اور پھر یہ منظر بھی دیکھا کہ انہی مقامات پر حضرت شاہ صاحبؒ کو سننے کے لئے اڈے ازدہام کو کنٹرول کرنے کے لئے انتظامیہ کی مدد لینا پڑی، یہ مرحوم اسماعیل سیٹھ کی لگن، جدوجہد اور اخلاص نیت کا کرشمہ تھا۔ نوے سال سے متجاوز عمر پاکر حسنِ نیت، اخلاص، تواضع، مہمان نوازی کی حسین صفات سمیت جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اللہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین..... بقیہ ص ۶ پر

ہوا کے دوش پر

✦ رضوان سلمانی، دیوبند

دارالعلوم وقف دیوبند میں تعلیمی سال کا آغاز : دارالعلوم وقف دیوبند میں باضابطہ تعلیم کا آغاز کردیا گیا، تعلیمی سال کا آغاز خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمی صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند نے درس بخاری شریف سے کیا۔ مولانا نے طلبہ سے ناصحانہ خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو اللہ رب العزت نے حصولِ علوم نبویہ کی توفیق دی، جن کامیاب طلبہ کا داخلہ دارالعلوم وقف دیوبند میں امسال ہوا ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان کی شبانہ روز جدوجہد بارآور ہوئی اور انہیں اس دینی درسگاہ سے اکتسابِ فیض کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے کہا کہ طلبہ عزیز آپ نے دینی تعلیم کے حصول کے لئے اپنا وطن، اپنے والدین، اپنے اعزاء اور اپنا گھربار چھوڑا ہے، اس لئے اپنے مقصد کے حصول میں پوری جدوجہد کریں اور اپنے والدین، اساتذہ اور ادارہ کی نیک نامی کا باعث بنیں۔ مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی شیخ الحدیث دارالعلوم وقف نے دوران خطاب فرمایا کہ طلبہ اکابر واسلاف کے نقشہ قدم پر چلیں اور ان کے طریقے کار کو اختیار کریں، انہوں نے کہا کہ محدثین نے حدیث اور اس کے ایک ایک لفظ کو حاصل کرنے کے لئے میلوں کا سفر کیا اور بے انتہاء مشقتیں برداشت کریں ان کی قربانیوں کے نتیجے میں یہ علوم ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کی خدمات آپ کے لئے سبق آموز ہیں، آپ کی ایک ایک ادا لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ انہوں نے کہا کہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دینی تعلیم سیکھنے کے لئے قبول فرمایا اور کہا مدارسہ اسلامیہ اسلام کے مضبوط قلعے ہیں جن کی بقا اور تحفظ کے لئے اللہ نے آپ کو مدارس اسلامیہ سے جوڑا ہے۔ مولانا نے کہا کہ تمام اعمال کا دارومدار نیت کے اوپر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی نیتوں کو درست رکھیں اور علم دین صرف اور صرف اللہ کے خوشنودی کے لئے حاصل کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ علم بغیر عمل کے بے سود ہے۔ بچپن سے جو طالب علم نمازوں اور سنتوں پر عمل پیرا رہے گا اللہ تعالیٰ ان کی غیب سے مدد کرے گا۔ ادارہ کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے دینی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ طالبانِ علوم نبویہ ہیں، آپ کا اللہ کے نزدیک الگ مقام ہے۔ انہوں نے کہا کہ علم کا خاصہ انکساری ہے، متواضع طرزِ زندگی اختیار کریں تاکہ آپ دین اسلام کے حقیقی ترجمان بن کر معاشرہ میں رائج بدعات وخرافات کو ختم کرسکیں۔ تقریب کا اختتام مولانا محمد سالم قاسمی کی رقت آمیز دعا پر ہوا۔

.....✦.....